# أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ

خواجہ شمس الدّین عظیمی

روحانی ڈائجسٹ میں شائع شدہ وہ مضامین جو ابھی تک کتابی شکل میں موجود نہیں تھے مراقبہ ہال عجمان متحدہ عرب امارات کے اراکین نے ایک کتابی شکل دینے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اراکین اس کاوش کو قبول فرمائے اور ہمیں الٰہی مشن کی فروغ میں مزید توفیق و ہمت عطا فرمائے۔

## فہرست


حبیب اور محبوبؐ ........ 5

عالم کاف۔نون ........ 8

استاد ازل ........ 12

روح امر الٰہی ہے ........ 15

آدمی دید است باقی پوست است ........ 18

روح سے دوری ........ 21

فلسفہء حیات ........ 24

قوت ارادی ........ 27

لاشعور نے کہا ........ 30

دولت پرستی شرک ہے ........ 32

ہر چیز خود کو کھا رہی ہے ........ 35

یقین کی دنیا ........ 37

تین دوست۔حقیقتِ حیات ........ 39

خدا پرستی ........ 41

بچپن کی تصویر ........ 44

خالق اور مخلوق کا رشتہ ........ 46

سائنس پکار اُٹھے گی ........ 50

فلسفہء مذہب وسائنس ........ 53

قرآنی سائنس ........ 56

مکتوبات مرشد ........ 58

32 تصویریں ........ 62

سکون کا گہوارہ ........ 64

روحانی ورثہ ........ 68

تصوف اور اصحاب رسول ........ 71

قرآن کانفرنس ........ 73

قرآن اور سائنسدان ........ 82

عظیم سائنسدان اللہ ........ 84
فلسفہ کی تاریخ ........ 86
امت مسلمہ کے چودہ سو سال ........ 89
معاشی نظام اور قرآن ........ 92
مذہب، شریعت اور طریقت ........ 95
آنکھوں پر پٹی باندھ لیں ........ 98
رمضان المبارک ........ 100
آؤ اقرار کریں ........ 102
شیطانی اور رحمانی کردار ........ 105

بہت پہلے جب رات دن نہیں تھے۔ مہینے سال نہیں تھے۔ نہ آسمان تھا نہ زمین تھی۔ تاریکی اور روشنی دونوں معدوم کے پردوں میں تھے۔ زماں و مکاں ( TIME & SPACE ) کی اصطلاحیں بھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔ پھر کیا تھا؟ ہُو کا عالم تھا۔ ایک ذات کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ذات نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو خود اس نے اپنے وجود سے ایک ہمراز بنایا۔ ہمراز بن گیا تو سرگوشی ہوئی۔ یہ کیسے پتہ چلے کی حبیب کون ہے اور ہمراز محبوب کون ہے۔ طے پایا کہ ہمراز محبوب اور حبیب کے تعارف کے لیے ایک فلم بنائی جائے۔ فلم کو دکھانے کے لیے پردے (SCREENS) لازم قرار پائے۔ فلمی ریکارڈ کی منظر کشی کے پھیلاؤ کے لیے ایک ماورائی مشین (PROJECTOR) بنی۔ اس طرح ایک مربوط نظام بن گیا۔ نظام کو مربوط رکھنے کے لیے قانون بنا۔ قانون یہ بنا کہ محبوب کو متعارف کرانے کے لیے وقفہ وقفہ سے سربراہی گروہ تشکیل دیا جائے۔ اور اس طرح کم و بیش ایک لاکھ سے زائد یا کچھ کم سربراہوں کی نگرانی میں وفود آتے رہے اور اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہے۔ ہر سربراہ نے علمی اعتبار سے اچھائی اور بُرائی کے تصور کا پرچار کیا۔ تاکہ ایک برادری دوسری لاکھوں برادریوں اور گروہوں سے ممتاز ہو جائے۔ ان سب کوششوں کے نتیجہ میں ایک معاشرہ قائم ہوا۔

اس مثالی معاشرہ کی پہلی اساس محبّت پر رکھی گئی۔ قانون بنا کہ پہلی محبت اس ذات سے کی جائے گی جس ذات نے سب کو بنایا۔ جب کہ اس کو کسی نے نہیں بنایا۔

بنانے والی ہستی چونکہ خود حَسِین ہے۔ حُسن معیار بنا۔ اس طرح معاشرہ کی دوسرے اساس خوبصورتی بنی۔ جہاں حُسن ہوتا ہے وہاں محبوب اور مقصود کی جستجو فطری اَمر بن جاتی ہے۔ چونکہ محبوت و مقصود خوبصورت ہے اس لیے ہر چیز خوبصورت لبادہ میں سجائی گئی۔ اور جمالیاتی حُسن ودیعت ہونے سے انسان طبعاً حُسن پرست ہو گیا۔ انسان حُسن سے محبت کرنے لگا۔ اور بدصورتی اس کے لیے ناپسندیدہ شے بن گئی۔ محبت کو پروان چڑھانے کے لیے عدل و انصاف کی میزان قائم کی گئی۔

مثالی معاشرہ کی تیسری اساس مکافاتِ عمل ہے۔ قانون کی شق میں وضاحت کی گئی کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ آدم زاد جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اِس دنیا میں اور عارضی دنیا کے اُس پار دوسری دنیا میں ایک ہی قانون نافذ رہے گا۔ مکافاتِ عمل کے قانون کی مزید تشریحات و توضیحات کے لیے اور اس قانون کو جاری و ساری رکھنے کے لیے انسانی اختیارات کی دستاویز تیار ہوئی۔ اختیارات کے سلسلہ میں اچھائی اور بُرائی کا تصور بنیادی اساس بنا۔ اچھائی اس لیے اچھائی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ عمل اچھا ہے۔ برائی اس لیے بُرائی ہے کہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ یہ بُرائی ہے۔ مفہوم یہ نکلا کہ اچھائی یا بُرائی اس پر قائم ہے کہ ہم اچھائی اور بُرائی کے تصور کو قبول کر چکے ہیں۔

بُرائی اور اچھائی کے تصورات کو عام کرنے اور اس کے نتائج مرتب ہونے کے عمل کو آخرت کا نام دیا گیا۔۔۔۔۔ ایک غیر منقسم واحد ذات نے اپنے فرستادہ دوستوں کے ذریعہ یہ پیغام عام کر دیا کہ دنیا مزرعِ الآخرۃ ہے۔ زندگی میں جو کچھ بویا جائے گا یہاں وہاں دونوں عالمین میں وہی کاٹنا پڑے گا۔

حیات کے اوپر غور کرنے کے نتیجے میں یہ انکشاف ہوا کہ نفس کو بخوشی یا کراہ کے ساتھ موت سے بغلگیر ہونا ہے اور فرد کو موت سے پنجہ آزمائی کرنی ہے۔اور موت اسے بہر حال شکست دیدے گی۔البتہ آدم زاد کو فنا نہیں کر سکتی۔اگر موت کو فانی تسلیم کر لیا جائے تو نظامِ حیات اور کائنات کا وجود باقی نہیں رہے گا اور اختیارات کی دستاویز کالعدم ہو جائے گی۔اختیارات سے مراد یہ ہے کہ فرد اپنی اس زندگی میں جو کچھ کرتا ہے سزا یا جزا کا خود تعین کرتا ہے۔اگر موت کے اوپر فنا وارد ہو جائے تو پھر جزا اور سزا، حساب اور کتاب کی کوئی حقیقت نہیں رہے گی۔ہوتا یہ ہے کہ موت مادّی وجود کو ہلاک کر کے روح کو آزاد کر دیتی ہے۔موت اور حیات کے نظام کے تحت فرد نے اپنی زندگی کو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے فرد جب حیات ممات کے دو شعبوں میں تقسیم ہو گیا تو بہت زیادہ پیچیدگی عمل میں آگئی اور اس پیچیدگی نے عقائد کا رُوپ دھار کر بیشمار نظریات کو جنم دیا۔اور جیسے جیسے نظریات کا ہجوم ہوتا رہا۔فرد اپنی انا سے دور ہوتا چلا گیا۔اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ پہلی ہستی کے وجود سے باغی ہو گیا۔وقت گزرتا رہا۔سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا فرد مزید گمراہی میں غرق ہو گیا۔اس علم کی بنیاد پر جس علم سے اسے اختیارات منتقل ہوئے تھے۔فرد نے اپنے لیے روشنی کی جگہ تاریکی کا انتخاب کر لیا۔اور یہ انتخاب پوری ایک برادری کے لیے اَدبار بن گیا۔پُر سکون قلعہ کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔دھوپ کی تمازت سے محفوظ رکھنے والی چھت زمین بوس ہو گئی۔

دیواروں کی دراڑوں میں سے گرد و غبار کا طوفان اور گرم ہوائیں قلعہ میں داخل ہو گئیں اور فرد کے پاس چیخنے چلانے کے علاوہ کوئی آسرا نہیں رہا۔آسرا کیوں نہیں رہا۔اس لیے کہ پرُسکون ہونے کے لیے جن جذبات واحساسات کی ضرورت ہے اُن سے فرد نے منہ موڑ لیا ہے۔

پہلی ہستی نے اپنے محبوب کو جس فطرت پر بنایا ہے وہ یہ ہے کہ فرد کے اندر آپس میں ایک دوسرے سے محبت ہو۔پوری نوع سے محبت ہو۔طلب و جستجو میں صداقت ہو۔ایسی صداقت جو تناور درخت بن جائے۔اور اس درخت سے محسن واحسان، اکرام و بخشش و عفو در گزر کی شاخیں پھوٹیں۔

واحد ہستی نے جب اپنے محبوب کو بنایا اور اس کے تعاون کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار دوستوں کو مامور کیا تو اس کے پیچھے یہ مقصد کار فرما تھا کہ فرد کی حیثیت ایک سے ختم ہو کر اجتماعی ہو جائے۔اجتماعی نشوو ارتقاء کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ فرد اپنی ہستی کو افراد میں مدغم کر کے اجتماعی طور پر سوچے اور عمل کرے۔فرد چونکہ فطرتاً مجبور ہے۔یہ مجبوری فرد سے تقاضا کرتی ہے کہ اس مالک و خالق، ہستی کو تلاش کیا جائے۔اس کی جستجو کی جائے جس کے قبضہ میں ہماری زندگی اور موت ہے۔بظاہر اس لاینحل پیچیدگی کو ختم کرنے لے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم مثالی معاشرہ کی اساس کو مضبوط اور مستحکم کریں۔اور یہ مثالی معاشرہ اسلام کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

اسلام کہتا ہے۔۔

احترامِ انسانی ہر شخص پر لازم ہے۔

جملہ بنی نوعِ انسان نسلاً ایک ہیں۔ان میں رنگ و نسل، علاقائی، قبائل یا قومی امتیازات غیر فطری ہیں۔

تمام نوعِ انسان اللہ کے بندے ہیں۔ان کے حقوق کا تحفظ ہر مسلمان پر فرض ہے۔

ایک انسان کا قتل کل نوعِ انسانی کے قتل کے برابر ہے۔

ایک انسان کی جان بچانا پورے نوعِ انسانی کی جانیں بچانے کے برابر ہے۔

امن و سلامتی کو برباد کرنا سب سے بڑی بُرائی ہے۔

فرد اور افراد دونوں آزاد پیدا ہوتے ہیں۔آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

خدمتِ خلق اور ملت سے وابستگی ضروری ہے۔

ہمسایوں کے حقوق کا بالخصوص احترام کیا جائے۔

ہر معاملے میں عدل وانصاف کا قیام ہونا۔

بھوک، بیماری، بیکاری دور کرنا مثالی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

حُسن سے محبت اور خوب تر کی تلاش ہونی چاہیئے۔

نیّت ہر حال میں حسین ہونی چاہیئے۔

ہر شخص پر دوسروں کی آزادی اور دیگر سیاسی حقوق کا احترام لازم ہے۔

افراد کی تعلیم و تربیت وقت کے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے،اس طرح کہ مثالی معاشرہ اور اسلام کا تشخص مجروح نہ ہو۔

علم و حکمت کا سیکھنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔اور انسان کو مرتے دم تک طالب علم رہنا چاہیئے۔

اسلامی معاشرے کے افراد بھائی بھائی ہیں۔ان کا سود وزیاں ایک ہے۔

تقوٰی اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ایمان مشاہداتی ہونا چاہیئے۔

جسم کی طرح روح کے اوپر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس کا علاج ہونا چاہیئے۔اور علاج پہلی ذات اللہ سے قربت ہے۔قربت کا طریقہ قیام صلوۃ ہے۔قیام صلوۃ مراقبہ ہے۔مراقبہ تعلق،اللہ کے لیے ذہنی مرکزیت (Concentration) ہے۔

ضمیر کی آواز کمزور اور جمالیاتی حِس مفلوج نہیں ہونی چاہیئے۔ضمیر کے اندر نورِ باطن کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے۔رحمتِ تمام بن کر انسان سمیت تمام مخلوقات سے محبت کی جائے۔

زمین اللہ کی ملکیت ہے۔زمین کے اندر اور زمین کے اوپر جو کچھ بھی ہے۔وہ تمام نوعِ انسانی اور دیگر مخلوقات کے مشترکہ استفادہ کے لیے ہے۔بداخلاقی، ترشروئی، کرخت لہجہ بُرائی ہے۔خوش خُلق اور شیریں مقال ہونا سعادت ہے۔

ملک وملت کو خارجی اور داخلی دشمنوں سے محفوظ رکھنا مثالی معاشرہ کی اوّلین ذمہ داری ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی موجود ہے،اس لیے ہے کہ اس کی ابتدا ہے۔ کسی شے کی شناخت کا ذریعہ اس کا آغاز ہے اور کسی شے میں ماہیت قلب ہونا اس بات کی نشانی ہے کہ شے کی پہلے سے ابتدا ہو چکی ہے۔اس لئے کہ شے میں تصرف بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ شے کا وجود اس طرح ہے کہ شے کی ابتدا انتہا اور بالآخر اس کا فنا ہونا ہے۔

نظام کائنات پر جو لوگ تفکر کرتے ہیں یہ بات ان کے لیے اظہر من الشمس ہے کہ کائنات مسلسل حرکت کا نام ہے۔ حرکت کے لیے کسی محور کا ہونا ضروری ہے۔ ہم محور کو اگر ایک دائرہ تسلیم کریں تو یوں کہا جائے گا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے پر حرکت کا تسلسل اور اختتام ہے ابتدا کی طرف حرکت کا دورانیہ ہی حرکت ہے۔

حرکت کی ابتدا جہاں سے ہوئی مذاہب نے اس کا نام ازل رکھا اور حرکت کے اختتام کو ابد کہا گیا۔ازل اور ابد ایسے دو زخ ہیں جن پر سماوات، ارض اور ان کے اندر موجودات کی زندگی بر سرِ عمل ہے۔ کائنات کی ابتدا اس طرح ہوئی کے خالق اکبر اللہ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کائنات کو ترتیب، توازن، معین مقداروں، حرکت، تغیر اور فنا کے فارمولوں پر تخلیق کیا جائے۔ چنانچہ خالق اکبر کے ذہن میں جو پروگرام تھا اس پروگرام کو جاری و ساری کرنے کے لئے "کن" فرمایا۔ "کن" ایک لفظ ہے لیکن اس لفظ کی افادیت اتنی ہے کہ کائنات میں کھربوں، سنکھوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ کھربوں، سنکھوں الفاظ کے سامنے بے معنی نظر آتے ہیں۔

خالق اکبر نے جب ک۔ن دو حرف فرمائے تو ان دو حرفوں کے بطن سے مخلوقات وجود میں آ گئیں۔ مخلوقات میں بنیادی مخلوق آدم اور جنات ہیں باقی بے شمار مخلوقات ذیلی تخلیق کے درجے میں آتی ہیں۔

عالم کن کے بعد سماوات، کہکشانی نظام، عالم ملائکہ، ارض اور بے شمار دنیائیں کب اور کس طرح وجود میں آئیں یہ علم لدنی کا ایک مکمل باب ہے جو انبیائے کرام علیہ السلام اور خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی علم ہے۔اس باب پر سے ان قدسی نفس حضرات نے بھی پردہ نہیں اٹھایا یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کے وارث ہیں۔

بہر حال یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دنیا بنی۔۔۔۔۔۔دنیا بنی،آسمان قائم ہوا، ملائکہ کا گروہی نظام ترتیب پایا۔ یہ بات بھی قرآن پاک میں بیان فرما دی گئی ہے کہ آدم کی پیدائش سے پہلے سماوات اور زمین کا نظام قائم تھا۔

اللہ تعالی نے گروہ ملائکہ اور گروہ جنات کو جمع کر کے فرمایا:

"میں زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ بنانے والا ہوں" (البقرۃ:۳۰)

فرشتوں نے عرض کیا کہ:

جس ہستی کو آپ نیابت اور خلافت منتقل فرما رہے ہیں یہ زمین میں فساد برپا کر دے گا، خون خرابہ کرے گا"۔(البقرۃ:۳۲)

فرشتوں کا یہ عرض کرنا کہ آدم زمین پر فساد برپا کر دے گا اور زمین کو لہولہان کر دے گا اس طرف اشارہ ہے کہ فرشتے ان عناصر سے واقف تھے جن عناصر سے آدم کا پُتلا تخلیق ہوا۔ یعنی زمین پہلے سے موجود تھی اور اس پر اتنا خون بہہ چکا تھا کہ اللہ تعالی نے نیابت اور خلافت کے منصب کے لیے آدم کو تخلیق کیا۔

اللہ تعالی نے آدم کو اپنی صفات (CREATIVE EQUATION) کا علم سکھا دیا۔ آدم سے فرمایا کہ "ہم نے تمہیں جو علوم سکھائے ہیں وہ فرشتوں کے سامنے بیان کرو"۔ آدم نے تخلیقی عوامل سے متعلق علوم جب بیان کئے تو فرشتوں نے اعتراف کیا:

"ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو علم دے دیا ہے" (البقرۃ: ۳۲)

اور فرشتوں نے آدم کی حکمرانی کو قبول کر لیا لیکن جنات کے ایک گروہ نے اپنی انا کے خول میں بند ہونے کی وجہ سے آدم کی حاکمیت کو قبول نہیں کیا۔

قارئین کرام! آیئے کائنات اور نظام کائنات کا کھوج لگانے کے لیے عالم کاف۔۔۔ نون یعنی ازل میں تفکر کرتے ہیں۔ جب ہم نظام کائنات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ذہن ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ نظام کائنات قائم رکھنے کے لیے قاعدوں، ضابطوں کا ہونا ضروری ہے۔

"کن" کے بعد اتنی مخلوقات کا وجود عمل میں آیا کہ اگر ان کو شمار کیا جائے تو اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق "سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور دنیا میں شماریات سے زیادہ درخت قلم بنا دیے جائیں تو مخلوقات کا شمار ممکن نہیں ہے"۔

اتنے بڑے نظام کو چلانے کے لیے اللہ تعالی نے زون قائم کیے۔

اس بات کو پھر سمجھئے!

"اللہ تعالی نے جب فرمایا "ہو جا" اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ذہن میں جو کچھ موجود ہے اللہ تعالی نے اس کو حکم دیا کہ "ہو جا"۔

تخلیق کا مفہوم یہ ہے کہ تخلیق خلق ہو جانے کے بعد جب تک تخلیق کرنے والا چاہے، قائم رہے، قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وسائل فراہم کیے جائیں۔ وسائل کے لیے ضروری ہے کہ وسائل کی تقسیم ہو۔

وہ مکرم و محترم حضرات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم لدنی کے وارث ہیں، بتاتے ہیں کہ اللہ تعالی نے جب کائنات تخلیق کی تو کائنات کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لئے وسائل بھی تخلیق کئے اور ان وسائل کو تقسیم کرنے کے لئے اپنا ایک نمائندہ معبوث فرمایا۔ اسی بات کو اللہ کے دوست اللہ کے ہمراز، اللہ سے قریب ترین مخلوق ہستی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

**"اول ما خلق اللہ نوری"**

یعنی کائنات کا پہلا مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

محترم دوستو!

تذکرہ آدم کی خلافت و نیابت کا ہو رہا تھا۔ آدم کی حاکمیت کے اقرار کے بعد تیسرا عالم یہ بنا:

اللہ تعالی نے آدم سے فرمایا "تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ۔ (البقرۃ: ۳۵)"۔

ا۔ جنت میں خوش ہو کر رہنا ہے۔ خوش ہو کر کھانا پینا ہے۔ جنت میں جب تک خوش رہو گے جنت کا کروڑوں اربوں میل کا رقبہ تمہارے زیر تصرف رہے گا۔ تم ٹائم اسپیس کی پابندی سے مستثنیٰ رہو گے۔ جہاں دل چاہے جا سکتے ہو۔

۲۔ جنت میں ایک درخت ہے اس کے قریب نہ جانا اور اگر اس درخت کے قریب گئے تو تمہارا شمار ظالمین میں ہو گا۔ جنت ایک ایسا پُر فضا، پُر خمار اور پُر نور مقام ہے کہ جس مقام پر ظالمین کا داخلہ ممنوع ہے۔

آدم سہواً درخت کے قریب چلے گئے جیسے ہی آدم شجر ممنوعہ کے قریب پہنچے انہیں اپنی نادانی اور غلطی کا احساس ہوا۔ جیسے ہی حکم عدولی کے احساس نے کروٹ بدلی آدم کا ذہن محدودیت میں داخل ہو گیا اور وہ جنت سے زمین پر اتر آئے۔

اللہ تعالیٰ ستار العیوب ہیں۔ غفار الذنوب ہیں، اور عفو و در گزر ان کی عادت ہے، رحمٰن و رحیم ہیں، آدم کی آہ و زاری پسند آئی اور معاف کر دیا گیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پابند حواس سے رستگاری حاصل کرنا ہو گی۔

جس نظام کی ابتدا ہوتی ہے اس نظام کی بلآخر انتہا بھی ہوتی ہے۔ جب ہم ازل کا تذکرہ کرتے ہیں تو کائنات کی ابتدا کا مفہوم ذہن میں آتا ہے اور جب ہم قیامت کہتے ہیں تو کائنات کی انتہا مقصود ہوتی ہے، ابتدا سے انتہا تک نظام قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا "تیری نسل کے لیے ہم اپنے منتخب بندے بھیجتے رہیں گے تا کہ تیری نسل ان کی پیروی کر کے دوبارہ جنت میں جا سکے"

یہ سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہو کر حضرت نوح تک پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک قائم رہا اور رشد و ہدایت کا یہ طریقہ قیامت تک قائم رہے گا۔

روایت ہے کہ اس پیغام کو عام کرنے کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر تشریف لائے، ہر پیغمبر کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم زاد کو اپنا کھویا ہوا وطن دوبارہ واپس لینا ہے اور وطن واپسی کا طریقہ ہے کہ شجر ممنوعہ (جنت) کے قریب جانے سے پہلے کی زندگی کو اپنایا جائے۔ ساتھ ساتھ ہر پیغمبر نے اس بات کا اعلان کیا کہ ہمارے بعد نجات دہندہ آئے گا۔ بالآخر سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ "میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں جو کچھ میرے بھائی پیغمبروں نے کہا ہے میں اسی کا اعادہ کر رہا ہوں۔ خالق اکبر اللہ ہے۔ پیغمبران کرام علیہ الصلوۃ والسلام نے توحید کا پرچار کیا ہے۔ میں بھی تصدیق کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے محبوب بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالمین میں موجود ہر مخلوق کے لئے رحمت ہیں۔ کوئی ان کی رسالت کا اقرار کرے یا نہ کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لئے رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہیں، رحمان و رحیم ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین ہیں۔

زمین پر موجود تقریباً چھ ارب معلوم آبادی میں ایک ارب مسلمان بستے ہیں۔ مسلمان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں۔ امت ہونے کے باعث ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا نمونہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے مطابق اس کے اندر دوسروں کو معاف کرنے کا جذبہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

۱۔ راستی پر قائم رہو۔

۲۔ تفرقہ نہ ڈالو، ایک دوسرے سے جڑے رہو۔

۳۔ جو تمہیں محروم کرے اس کے ساتھ سخاوت برتو۔

۴۔ جو تم پر زیادتی کرے اسے معاف کر دو۔

۵۔ اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کرو۔

۶۔ نگاہ، عبرت کی نگاہ ہو۔

۷۔ گفتگو میں ذکر الٰہی کا غلبہ ہو۔

۸۔ نماز میں اللہ کے ساتھ ربط قائم کرو۔

۹۔ خود نیک بنو اور نیکی کا حکم دو۔

۱۰۔ خوش رہو اللہ کا شکر ادا کرو۔

۱۱۔ حق تلفی نہ کرو، سب کے حقوق پورے کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے؟"

حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

"جو لوگ محض کلمہ پڑھتے ہیں وہ مومن نہیں ہیں اس لیے کہ وہ زبان سے **لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ** کہتے ہیں لیکن حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کلمہ کا مقصود اور معنی کیا ہیں۔ وہ نہیں جانتے کس بات کی نفی کر رہے ہیں اور کس بات کا اقرار کر رہے ہیں"۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ! کلمہ کیا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کلمہ یہ ہے کہ مومن ماسوااللہ کی نفی کر دے اور ذات احدیت کو ہر جگہ اور ہر چیز میں ملاحظہ کرے، مومن کی فراست یہ ہے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ جس طرف منہ کرو وہاں اللہ کو پاؤ گے۔ مومن کے دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دیکھتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور دوسری طرز یہ ہے کہ مومن خود اللہ کو دیکھتا ہے"۔

ایک دفعہ حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا "اے حارثہ تم نے صبح کیسے کی؟"

انہوں نے کہا "میں نے ایسے حال میں صبح کی میں اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا ہوں"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو بات تم کہتے ہو اس پر غور کرو کیونکہ ہر چیز کی حقیقت ہوتی ہیں۔ بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟"

حضرت حارث نے عرض کیا "میں نے اپنے نفس کو دنیا سے الگ کر لیا۔ میرے نزدیک پتھر، سونا چاندی اور مٹی کا ڈھیلا سب برابر ہیں۔ شب بیدار ہوں اور روزے رکھتا ہوں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں اپنے رب کو عرش پر دیکھتا ہوں اور جنت کے باسیوں کو آپس میں باتیں کرتا سنتا ہوں اور اہل دوزخ کو دیکھتا ہوں کہ وہ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں"۔

حضرت حارث کی یہ کیفیت سن کر سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

"اے حارثہ! تم نے اپنے رب کو خوب پہچانا، پس اس عرفان اور ایمان کو اپنے اوپر لازم کر لو"۔

ایک وقت تھا کہ کچھ نہیں تھا۔ کوئی یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کہکشانی نظام کس نے بنایا ہے۔ کون ہے وہ ذات جسکے ذہن کی بو قلمونی نے کروٹ بدلی تو رنگ رنگ کہکشائیں۔ کہکشاؤں میں شمسی نظام اور شمسی نظام میں سیاروں اور ستاروں کی قندیلیں، قطار در قطار وجود میں آگئیں۔ سب کچھ موجود ہونے کے باوجود پھر بھی کچھ نہیں تھا۔ کیوں نہیں تھا،اس لیے نہیں تھا۔ کہ ہونا اس وقت ہوتا ہے جب اسکا علم ہو۔

استاد ازل نے سب کچھ اپنے لیے۔ اپنے ذہن کے لیے، اپنے علم کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ استاذ ازل کے ذہن میں حرکت ہوئی تو علم کے نو ادرات، علم کے نقش و نگار، علم کی گہرائی اور علم کی افادیت کے خزانے منظر عام پر آنے کے لیے مچلنے لگے۔ علم میں حرکت اور مسلسل حرکت سے استاذ ازل کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ علم کو سمیٹ کر رکھنے کی بجائے پھیلا دینا چاہئیے، بکھیر دینا چاہئیے۔ اس طرح پھیلا دینا اور بکھیر دینا اور بکھیر دینا چاہیے کہ ایک کائنات بن جائے اور۔۔۔۔۔۔۔۔ کائنات بن گئی۔ کائنات بن گئی تو کائنات کو پھیلانے کے لیے، زینت دینے کے لیے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا کائنات کی ایک ضرورت بن کر سامنے آئی۔ منظم اور مربوط تقسیم در تقسیم کائناتی پروگرام کے لیے نوعی پروگرام عمل میں آیا۔ ہر نوع کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا گیا۔ تاکہ آپس میں تعارف قائم رہے۔ اور پھر ہر نوع افراد پر تقسیم ہوگئی۔ اسطرح افراد کا کنبہ اجتماعی روپ میں جلوہ گر ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب تو ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ سب ہونے میں علم بنیاد بنا۔ علم سکھانے کے لیے استاد کی ضرورت کے پیش نظر خود علم کا خالق استاد بن گیا۔ اس مقدس بااختیار صاحب قدرت استاد نے پہلے فرشتوں پھر جنات کا بحیثیت شاگرد انتخاب کیا۔ ان کو وہ علوم سکھادیئے۔ جن علوم کو پڑھ کر فرشتے اور جنات یہ جان گئے کہ کائنات ''نوعی حلقوں'' میں حرکت کر رہی ہے۔ نوعی تقاضوں اور نوعی انرجی کو فرشتوں اور جنات نے صاحب قدرت استاد کے دیئے ہوئے اختیار سے منظم کیا اور۔۔۔۔۔۔ کائناتی تسلسل اپنے محور پر حرکت میں آگیا۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ کب تک قائم رہا کتنی صدیاں گزر گئیں اور کتنے قرن بیت گئے۔ مگر نظام چلتا رہا۔ پھر یہ ہوا کہ تعمیر کی جگہ علم میں جنات شاگردوں نے تخریب کو شامل کر دیا۔ تخریب سے کائناتی تسلسل میں رخنہ در آیا تو ایک چھوٹا نظام عالم ناسوت (دنیا) افراتفری کا شکار ہو گیا۔ فسادات پھوٹ پڑے۔ ایک نوع کا ہر فرد خود کو اپنی ہی نوع کے دوسرے فرد سے ممتاز سمجھنے لگا۔ کبر و نخوت نے نوع کے افراد کو درندہ صفت بنادیا۔ بے رحمی نے جنات برادری کو رحم و کرم سے دور کر دیا۔

صاحب قدرت رحیم و کریم، مشفق اور محب استاذ ازل اپنے علم کو یوں پامال ہوتے نہیں دیکھ سکا۔ اس کے ذاتی علم ''امر'' نے ارادہ کر کے کائناتی نظام کو از سر نو ترتیب دیا۔ ایک نئی نوع کی تخلیق پر کام ہوا۔ اور اس طرح تیسری نوع نوع آدم بن گئی۔

آدم کو صاحب قدرت استاد نے موجود دو نوعوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت، زیادہ طاقت ور زیادہ فہم و فراست سے معمور ذہن عطا کیا۔ اور اس کو وہ علم سکھا دیے۔ جو پہلے موجود نوعوں کو نہیں سکھلائے تھے۔

فرشتوں نے احتجاج کیا کہ یہ نوع جس کو آپ نے ہمارے اوپر برتر کردیا۔۔۔۔۔۔۔۔خون خرابہ اور فساد برپا کردیگی۔ صاحب قدرت استاد نے احسن تقویم نوع کے ایک فرد آدم کو خصوصی اسرار ورموز سکھا کر حکم دیا۔۔۔۔۔۔۔اے ہمارے ہونہار شاگرد ہم نے تجھے جو علوم سکھادیے ہیں وہ تو بیان کردے۔ آدم نے فرفر پڑھنا شروع کردیا۔ فرشتے انگشت بدنداں رہ گئے اور برملا پکار اٹھے۔

ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں

ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں

جتنا آپ نے ہمیں سکھادیا ہے۔(البقرۃ:۳۲)

فرشتوں نے اپنی بے بضاعتی اور آدم کے مقابلے میں اپنی کم علمی کا اعتراف کر کے خود کو محفوظ ومامون کرلیا۔ نوع جنات کے ایک اعلیٰ اور ممتاز فرد ابلیس نے آدم کی فضیلت کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ وہ خود کو علم کا امین نہیں، عالم سمجھتا تھا۔ غرور وتکبر میں وہ گویا ہوا۔ میں تو آگ کا بنا ہوا ہوں۔ اور میرے بعد آنے والا آدم مٹی کا بنا ہوا ہے۔ آگ مٹی کے سامنے کیسے جھک جائے؟

ابلیس نے یہ نہیں سوچا کہ آگ کا کام جھلس دینا، جلادینا، فنا کردینا اور بھسم کردینا ہے۔ جبکہ مٹی میں نمو ہوتی ہے۔ مٹی میں سے ہرے بھرے درخت اگتے ہیں۔ رنگ رنگ پیراہن پہنے ہوئے پھول کھلتے ہیں۔

سبزہ زار قالین بھی مٹی سے بنتا ہے۔ مٹی کی کوکھ سے پانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ آبشاریں گرتی ہیں نخلستان بنتے ہیں۔ پرندوں کی ڈاریں فضا میں اڑتی ہیں تو مٹی کی کشش انہیں دوبارہ مٹی پر لے آتی ہے۔ ریگستانوں میں اونٹوں کی قطاریں اور انکے گلوں میں بجتی گھنٹیوں کی بازگشت بھی مٹی کے طفیل ہے۔ مٹی کیا ہے۔ مٹی ظہور عجائب ہے۔

مٹی کیا ہے۔ انکساری کا ایک عمل ہے۔ مٹی کیا ہے۔ آدم کی پیشانی پر انسانیت کا جھومر ہے۔ مٹی کیا ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ مٹی کیا ہے۔ بیت المقدس ہے۔ مٹی کیا ہے۔ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی جنم بھومی ہے۔ مٹی کیا ہے۔ اس ذات صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن ہے جن کے لیے یہ ساری کائنات بنائی گئی ہے۔ مٹی ہی تو ہے جسکے وجود سے سورج کی روشنی ہے۔ مٹی ہی تو ہے جس پر چاند کی روپہلی چاندنی جب درختوں میں سے چھن کر نیچے آتی ہے تو درختوں پر ہوا سے ہلتے ہوئے پتے ایک دلآویز رعنائی بن جاتے ہیں۔ مٹی نہ ہو تو چڑیوں کی سریلی آواز، چکور کی اڑان، شاہین کی پرواز اور معصوم صورت فاختہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔

قصہ کوتاہ! استاد ازل نے اپنے شاگرد رشید آدم کو ایسا علم سکھادیا جو آدم کے علاوہ کسی کو نہیں آتا تھا اور آج بھی نہیں آتا۔ صاحب قدرت استاد نے اپنے بھولے شاگرد بندے کو رہنے کے لیے جگہ دی۔ کھانے کے لیے پھل دیئے۔ پینے کے لیے شیریں پانی دیا اور اس وسیع وعریض قطعہ کو استعمال کرنے کے لیے کلی اختیار بھی دے دیا۔ مقام کی وسعت، ماحول کی خوشنمائی۔ معطر معطر فضا، خراماں نسیم، خوبصورت پررونق اور روشن روشن پھولوں کی اس دنیا کا نام جنت رکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آدم کی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک رفیقہ بھی اس کے سپرد کردی گئی۔

نوع جنات کا ممتاز فرد ابلیس، آدم کے اوپر صاحب قدرت استاد کی عنایات و اکرامات کو نہ دیکھ سکا حاسد بن گیا۔ اور خفیہ ریشہ دوانیوں سے آدم کو ورغلا کر اس راستے پر لے آیا جس کی وجہ سے خود راندہء درگاہ ہوا تھا۔ صاحب قدرت استاد نے اپنے شاگرد آدم سے بازپرس کی۔ آدم نے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ استاد کے سامنے ہاتھ باندھ لیے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہائے دیئے۔ گداز دل کے ساتھ اپنی تقصیر کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ التجا کی اے میرے مربی مشفق استاد، میرے خالق اللہ، تو نے معاف نہیں کیا تو میں کہاں جاؤں گا۔ میری ہستی بکھر جائے گی۔ میرا اپنا ظلم مجھے ہست سے نیست کر دے گا۔ تو نے مجھے احسن تقویم بنایا ہے۔ میرے پیارے اور شفیق استاد اللہ، اپنی رحمت سے مجھے معاف کر دے۔

صاحب قدرت استاد کو اپنی تخلیق آدم کی یہ ادا پسند آئی اور وہ خوش ہو گیا۔ آدم اس طرح معاف کر دیا گیا کہ صاحب قدرت استاد نے اسکی نسل پر اپنے علوم کے خزانے کھول دیئے۔ اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری ہو گیا۔ آدم کے بعد ایک اور آدم ثانی نے اس علم کو اپنی نسل میں پھیلایا۔ پھر پیغمبر ابراہیمؑ کی نسل میں محمدؐ تشریف لائے اور باعث تخلیق کائنات ہمراز سبحان ربی الاعلیٰ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی وارثین میں استاد ازل کے فیض یافتہ شاگرد قلندر بابا اولیاؒ کا ظہور ہوا۔

عظیم روحانی سائنسداں قلندر بابا اولیاؒ جن کا نام حسن اخریٰ محمد عظیم برخیاؒ ہے۔ صاحب قدرت استاد اللہ جل شانہ کے ایسے ہی نورانی شاگرد اور بندے ہیں جیسے شاگرد نوع انسانی کے جد امجد باوا آدم تھے۔

ستائیس جنوری انیس سو اناسی عیسوی کو حامل علم لدنی اللہ کے نائب (خلیفتہ الارض) ایک کائناتی حلقے سے رخت سفر (علم الاسماء) باندھ کر دوسرے حلقے عالم اعراف میں چلے گئے۔ دوسرے حلقے سے تیسرے حلقے حشر و نشر کا انتظام و انصرام ابھی باقی ہے۔ تیسرے حلقے سے چوتھے حلقے آدم و حوا کے وطن مالوف میں قلندر بابا اولیاؒ کے لیے حور و غلماں چشم براہ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ کون جانے یہ ازلی سعید، صاحب اختیار ہستی اپنی آخری قیام گاہ جنت کو بناتی ہے۔ یا اعلیٰ علیئین استاد ازل کی قربت کے لیے مرتبہ حضوری میں فائز المرام ہوتی ہے۔

دوستو! ہم مشرب مے نوشو، جلوہ یار کے پروانو، صوت سرمدی کے مستانوں، آؤ ہم تمنا کریں

کل نفس ذائقۃ الموت

کے بعد اعلیٰ علیئین میں اپنے مشفق و کرم فرما استاد قلندر بابا اولیاؒ کے ساتھ ہمارا قیام ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(آمین)

خوش نصیب ہیں وہ روحیں جو اپنے جسمانی لباس کے ساتھ ہر سال ۲۷۔ جنوری کو صاحب قدرت استاد ازل کے شاگرد احسن الخالقین اللہ کے دوست ابدال حق حسن اخریٰ سید محمد عظیم برخیا المعروف قلندر بابا اولیاؒ کے عرس مبارک میں شریک ہو رہے ہیں۔

**من عرف نفسه فقد عرف ربه** "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔"

اپنا عرفان رکھنے والا شخص ہی خالق کائنات کا عرفان حاصل کر سکتا ہے اور عرفان کے نفس و مراتب ہیں۔

من عرف نفسہ فقد عرف، کے تحت ہم اس کی وضاحت کریں گے کہ عرفان نفس سے اللہ تعالیٰ کے عرفان کا کیا تعلق؟ اور اللہ تعالیٰ سے متعارف ہونے کے لئے پہلے اپنے نفس سے متعارف ہونا کیوں ضروری ہے، اس سلسلے میں قرآنی تعلیمات کے نقطہ نظر سے انسان کے مندرجہ ذیل اوصاف زیر بحث آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں ارض میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، ملائکہ نے عرض یا، یہ تو خون خرابہ اور فساد کرے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے اور پھر آدم کو علم الاسماء عطا فرما کر فرشتوں سے اس بات کا اقرار کروالیا کہ جو علم آدم کو عطا کیا گیا، فرشتے اس علم سے ناواقف ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہین، ہم نے انسان کو کھنکھناتی مٹی (خلا رکھنے والی) سے پیدا کیا، ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی، انسان ہماری ہی سماعت سے سنتا ہے، ہماری ہی بصارت سے دیکھتا ہے اور ہمارے دیئے ہوئے فواد (ذہن) سے سوچتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ کے تحت مندرجہ ذیل باتیں زیر بحث آتی ہیں:۔

۱۔ آدم کی خلافت اور نیابت

۲۔ نیابت اور خلافت کا علم

۳۔اس علم (ایڈمنسٹریشن) کو استعمال کرنے کے لیے اختیارات

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ہم نے اپنی امانت (نیابت) سماوات، ارض اور جبال کو پیش کی، سماوات ارض اور جبال نے اس امانت (نیابت) کو قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اس بار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مگر انسان نے اسکو بے سوچے سمجھے قبول کر لیا پس تحقیق یہ ظالم اور جاہل تھے۔ (سورۃ الاحزاب)

قرآن پاک ہمیں عرفان نفس کے سلسلے میں جن علوم سے روشناس کراتا ہے وہ دو ہیں، ایک وہ علم جو معاشرتی اقدار کو قائم رکھنے کے ہلیے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا علم وہ ہے کہ جس میں تخلیق کائنات اور اس تخلیق میں عمل درآمد کرنے والے قانون کی وضاحت ہوتی ہے، معاشرتی اقدار کو قائم رکھنے والا علم سب کا سب علم شریعت کے نام سے موسوم ہے، اور تخلیق کائنات میں عمل درآمد کرنے والا علم (علم نیابت) سب کا سب علم تکوین ہے۔

کوئی بھی انسان جب تک علم شریعت اور علم تکوین کے ابتدائی مراحل سے نہ گزرے عرفان نفس حاصل نہیں کر سکتا، شریعت میں علم پہلے اور عمل بعد میں آتا ہے، شریعت میں علم پہلے اور عمل بعد میں آتا ہے، شریعت میں ذہن اور شعور کسی عمل کو اختیار کرنے یا نہ کرنے پر مختار ہے، تکوین میں شعور انسانی کی جگہ شعور کائنات (انسانی لاشعور) کام کرتا ہے اس عالم میں وہی اختیارات استعمال ہوتے ہیں جو قدرت کی طرف سے ودیعت کیے گئے ہیں، ان کا استعمال منشاء قدرت اور مشیت الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

شریعت اور طریقت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، شریعت نام ہے معاشرتی پروگرام (علم) کا اور طریقت نام ہے اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا البتہ تکوین بالکل الگ علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم نبوت میں اس علم کا نام لدنی ہے اور یہی وہ علم ہے جس کی بناپر آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا، یہی وہ علم ہے جس کو قبول کرنے سے سماوات، ارض اور جبال نے معذرت ظاہر کی۔ اور یہی وہ علم ہے۔۔۔جو کائنات میں انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا، قرآن پاک میں اس علم کی نشاندہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے، حضرت موسیٰؑ صاحب شریعت اور صاحب طریقت تھے، علم شریعت یہ کہ ان کے پاس قوم کی رہنمائی کا پروگرام تھا اور طریقت یہ کہ اس پروگرام کے تحت ان کو اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل تھا۔

نفس کا عرفان دو طرح ہوتا ہے، عرفان نفس کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ہمارا تخلیق کرنے والا کون ہے، اور اس تخلیق میں خالق کی کیا کیا نشانیاں موجود ہیں، ہم ان نشانیوں سے کس طرح وقوف حاصل کر کے خود کو پہچان سکتے ہیں خود کو پہچاننا یہ ہے کہ انسان اس کو تلاش کرے کہ اس کی تخلیق کا منشا اور مقصد کیا ہے، یہ بات ہم پہلے کسی مضمون میں سمجھا چکے ہیں کہ انسان کی حیثیت، خیالات، تصورات اور احساسات سے باہر کچھ نہیں ہے، خیالات اور تصورات ہی زندگی ہیں اگر زندگی میں سے تصورات اور خیالات کو نکال لیا جائے تو زندگی کی حیثیت معدوم ہو جائے گی، یہ بات معلوم کرنا کہ خیالات اور تصورات کا منبع (SOURCE) کیا ہے اور کس طرح بنتے اور عمل کرتے ہیں یعنی قدرت کا کونسا نظام اس میں عمل کر رہا ہے، زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہو جاتی ہے، انسان کیوں مجبور اور کیوں بے اختیار ہے، کیوں وہ خود پیدائش پر دسترس نہیں رکھتا اور کیوں مرنے پر مجبور ہے، اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ فرشتوں اور جنات کی موجودگی اس کی پیدائش کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی کونسی مشیت کام کر رہی ہے۔

زمین پر ملائکہ، چاند سورج اور بے شمار کہکشانی نظام اس کی خدمت کے لیے کس قانون کے زیر اثر پابند ہیں۔ وَسخر لکم مافی السمٰوات والارض جمیعا منه۔ اور ہم نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سماوات اور ارض کو اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب وسخر لکم الشمس والقمر اور ہم نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سورج اور چاند کو وسخر لکم اللیل والنہار اور مسخر کر دیا تمہارے لیے رات اور دن کو (-) انسان احسن تقویم ہوتے ہوئے کیوں اسفل السافلین میں پڑا ہوا ہے؟ ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنا اسفل سافلین۔۔۔ عرفان نفس سے یہ سارے نکات واضح ہو جاتے ہیں۔

جب کوئی انسان ان حقائق کو سمجھنے لگتا ہے کہ تسخیر ارض اور اس کے اندر کل اشیاء تسخیر قمر، تسخیر الشمس اور تسخیر لیل ونہار میں اللہ تعالیٰ کا کونسا قانون کام کر رہا ہے تو اس کے سامنے یہ بات آ جاتی ہے کہ انسان اور کائنات میں ہر موجود شئے اللہ تعالیٰ سے ایک رشتہ مشترک رکھتی ہے اسی رشتہ مشترک کی بناء پر کائنات میں ہر شے ایک دوسرے سے کسی نہ کسی عنوان سے روشناس ہے، ایک بچہ ستارہ کو اس لیے پہچانتا ہے کہ بچے اور ستارہ کا ذہن تخلیقی رشتہ میں ایک ہی خالق کے ساتھ منسلک اور مربوط ہے، ایک بکری، انسان اور بھیڑیے کو اس لیے پہچانتی ہے کہ بھیڑیا، انسان اور بکری ایک خالق اور مالک کی تخلیق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں، یہی رشتہ انسان کو عرفان نفس اور خالق کائنات کے عرفان کا وجدان عطا کرتا ہے، اور یہ وجدان اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت سے قریب ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

عرفان نفس کا دوسرا مرتبہ

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا، آدم کو بنانا ہے زمین میں خلیفہ، فرشتوں نے عرض کیا یا اللہ یہ فساد اور خون خرابہ کرے گا اور دیکھئے ہم آپ کی حمد و ثنا میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اور پھر آدم کو علم الاسماء (صفات الٰہیہ کا علم) عطا فرمایا، پھر فرشتوں سے دریافت فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ علم کیا ہے؟ فرشتوں نے اپنی لاعلمی کے اعتراف کے بعد کہا ہم وہی جانتے ہیں جو آپ نے ہمیں سکھایا

ہے اور آدم نے اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ علم الاسماء کو بیان کر دیا،اس کے بعد فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کریں،سب کے سب سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نے نافرمانی کی اور وہ اللہ کے حکم سے منکر ہو گیا۔(البقرۃ:۳۰:۳۶)۔"اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے میں تخلیق کروں گا،ایک بشر بجنی مٹی (خلاء) سے پھر جب مکمل کروں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سجدہ کرنا اس کو، جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے بشر (آدم کا پتلہ) میں اپنی روح پھونکی، سجدہ کیا سب فرشتوں نے ایک ساتھ مگر سوائے ابلیس کے کہ سجدہ کرنے والے کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا(سورۃ الحجر:۲۸-۳۱)

آیات مندرجہ بالا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آدم جس وقت تک پتلہ (خلا) ہے اس کو اللہ تعالیٰ بشر فرماتا ہے،جب اس خلا کو روح سے پُر کر دیا گیا۔ تو اس کا نام آدم ہو گیا۔قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی قرآن نے وضاحت نہ کی ہو (سورہء کہف)آیئے قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں یہ معلوم کریں کہ روح کیا ہے؟

روح کی تعریف

قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے،اے رسول آپ سے سوال کرتے ہیں کہ روح کیا ہے؟آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کا امر ہے(سورہ بنی اسرائیل)

اب دیکھئے قرآن پاک امر کی تعریف کن الفاظ میں کرتا ہے۔

"اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ(امر) کسی چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے"کن۔۔وجود میں آجا فیکون" وہ وجود میں آجاتی ہے، اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے:۔

بشر پتلہ ہے، پتلہ خلاء ہے، خلاء یا بشر میں اللہ تعالیٰ کا امر (روح) ہے، جس کو اللہ تعالیٰ آدم فرماتے ہیں روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے تخلیق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے۔عدم سے وجود میں آجا اور وہ ہو جاتی ہے۔

ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی دوست ہوتا ہے۔ کسی کے پاس دوستوں کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے۔ اور کوئی پوری زندگی دوست کی تلاش میں سر گرداں رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ میرا بھی ایک دوست ہے۔ وہ دوست مجھ سے اس وقت سر گوشی کرتا ہے جب میرے اوپر سے حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے۔ اس دوست کے دوست بھی بہت ہیں۔ میں نے سوچا کوئے یار میں دوست کے دوستوں سے جمالِ یار کا تذکرہ ہو جائے ایک لاکھ سے زیادہ ان گریبان چاک مخمور نظر دوستوں سے ملاقات ہوئی پتہ چلا۔ ایک لاکھ حق پرست دوستوں نے یار کا جلوہ الگ الگ روپ میں دیکھا۔ ہر دوست نے یار کو جس جلوہ میں دیکھا۔ دوسرے نے اس سے مختلف تجلی میں مشاہدہ کیا۔ ان دوستوں میں سے ایک دوست شمس تبریزی کے غلام مولانا روم بھی ہیں۔ ان کی روح گویا ہوئی۔

آدمی دیداست باقی پوست است

دید آں باشد کہ دید دوست است

آیئے! آج کی نشست میں مولانا روم رحمت اللہ علیہ کے اس شعر پر گفتگو کی سعادت حاصل کریں

کوئی اطلاع یا کسی شے کا علم ہمیں لازمانیت سے موصول ہوتا ہے۔ یہی لازمانیت نئی نئی اطلاعات زمانیت (وقت) کے اندر ارسال کرتی رہتی ہے۔ اگر ہم لازمانیت کو ایک نقطے سے تشبیہ دیں تو یوں کہیں گے کہ اس نقطہ میں کائنات کا یکجائی پروگرام نقش ہے۔ لہروں کے ذریعے اس نقطے سے جب کائنات کا یکجائی پروگرام نشر ہوتا ہے تو انسانی حافظے سے ٹکرا کر بکھرتا ہے بکھرتے ہی ہر لہر ایک مختلف شکل و صورت میں تصویری خدوخال اختیار کر لیتی ہے۔ لہروں کا حافظے کی سطح پر آکر بکھرنا ہی وقت کو وجود میں لاتا ہے چونکہ حافظہ جبلی طور پر (فطری طور پر نہیں) محدود ہے اس لیے تصویر کے مابین فاصلہ بن جاتا ہے اسی فاصلے کا دوسرا نام دوری کا احساس اور وقت کو طوالت ہے اگر ہم اس بیس BASE یا نقطہ کو تلاش کر لیں جہاں کائنات کا یکجائی پروگرام نقش ہے تو فاصلہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

آپ نے سنیما گھروں میں دیکھا ہو گا کہ اسکرین کے بالمقابل ایک جگہ پروجیکٹر نصب ہوتا ہے آپریٹر اس پر فلم چڑھا کر سوئچ آن کر دیتا۔ فلم کے فیتے پر محفوظ نقوش روشنی کی لہروں کے ذریعے سفر کرتے ہوئے اسکرین پر مظاہر بن جاتے ہیں۔ اگر آپ پروجیکٹر اور اسکرین کے درمیان خلاء میں نظر دوڑائیں تو صرف روشنی کا ایک دھارا نظر آئے گا۔ روشنی کی انہی لہروں میں تمام تصویریں محفوظ ہوتی ہیں جو روشنی کے دوش پر سفر کرتی ہوئی اسکرین تک پہنچ رہی ہیں۔ اس طرح تین رُخ قائم ہوتے ہیں ایک فلم پر نقش شدہ نقوش دوسرا روشنی یا لہروں کا نظام جس کے ذریعہ تصاویر سفر کرتی ہیں اور تیسرا وہ اسکرین جہاں یہ لہریں ٹکرا کر تصویری خدوخال بن جاتی ہیں۔ پہلے دو رخوں کو ہم لازمانیت کہہ سکتے ہیں ان دونوں میں وہ تمام نقوش موجود ہوتے ہیں جو اسکرین سے ٹکرا کر مظاہر بنتے ہیں اسی طرح لازمانیت میں کائنات سے متعلق تمام اطلاعات موجود ہیں زندگی کا کوئی نقش یا کوئی حرکت لازمانیت کے دائرے سے باہر نہیں ہے یہ اطلاعات تیسرے رخ میں جب ذہن کی سطح پر وارد ہوتی ہے تو انسان اپنی شعوری ساخت کی بنا پر انہیں فاصلے اور

وقت کے خانوں میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے سمجھا یہ جاتا ہے کہ گوشت پوست سے مرتب اور رگ پٹھوں سے بنے ہوئے جسم کی صلاحیتیں اور صفات صلاحیتوں کی انتہا ہے اور گوشت پوست کے جسم سے ہی تمام انسانی صلاحیتیں متحرک ہیں ایسا نہیں ہے اس بات کو مثال سے بیان کیا جائے تو کہا جائے گا انسان گوشت پوست سے بنے ہوئے جسم کی حفاظت کے لیے لباس بناتا ہے۔ فی الحقیقت اس لباس میں اپنی کوئی زندگی یا حرکت نہیں ہوتی جب یہ لباس جسم پر ہوتا ہے تو جسم کے ساتھ حرکت کرتا ہے یعنی اس کی حرکت جسم سے منتقل ہو کر اسے ملتی ہے لیکن حقیقت میں وہ جسم کے اعضاء کی حرکت ہوتی ہے اگر اس لباس کو جسم پر سے اُتار دیا جائے تو اس کے اندر کوئی حرکت باقی نہیں رہتی اب ہم اس لباس کا مادی جسم کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں آدمی مر گیا اس کے مردہ جسم میں زندگی کا کوئی شائبہ کسی لمحہ بھی پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے اگرچہ زندگی کے تمام عوامل ہوا، پانی، غذا، روشنی وغیرہ سب موجود ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرنے کے بعد جسم کی حیثیت صرف لباس کی رہ جاتی ہے اصل انسان اس میں موجود نہیں رہتا اگر یہ جسم اصل انسان ہوتا تو کسی نہ کسی نوعیت سے اس کے اندر زندگی کا کوئی شائبہ ضرور پایا جاتا اس صورت حال میں ہم انسان کا تجسس کرنے پر مجبور ہے جو انسان مادی جسم کو چھوڑ دیتا ہے وہی تمام صلاحیتوں کا مخزن و منبع ہے یہی وہ انسان ہے جس کی حرکات و سکنات کو ہم زندگی کہتے ہیں مادیت کے دائرے میں کتنی چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ بہت چھوٹے ذرات ایٹم اور ایٹم میں الیکٹران پروٹان اور دیگر ایٹمی ذرات ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں جیسے جیسے فاصلہ بڑھتا ہے۔ ہم اشیاء کی صحیح ہیئت اور ان کی تفصیلات نہیں دیکھ سکتے۔ چند سو گز دور کا درخت اور اس کے پتے نظر نہیں آتے۔ عمارتیں اور ان کے خدوخال نگاہ کی ناتوانی کی وجہ سے دھندلے دکھائی دیتے ہیں سائنسی علوم کہتے ہیں کہ ایٹم میں ارتعاش ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں الیکٹران ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں مائع میں مالیکیول بے ترتیب حرکت کرتے ہیں اور گیس میں ایٹم اور مالیکیول ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑتے پھرتے ہیں لیکن اشیاء ہمیں ساکت نظر آتی ہیں بہت سی چیزیں ہمیں دکھائی نہیں دیتیں لیکن ان کے اثرات سے انھیں پہچانا جاتا ہے مثلاََ بجلی کا بہاؤ۔ مقناطیسی میدان اور دوسری بہت سی لہریں جب ہم طبعی فارمولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کسی ایجاد کی مدد لیتے ہیں تو بہت سی چھپی ہوئی چیزیں اور مستور زاویے نظر آجاتے ہیں جب خوردبین کا لینس آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو چھوٹے سے چھوٹا جراثیم، وائرس اور دیگر باریک زرات دکھائی دینے لگتے ہیں الیکٹران مائکرو اسکوپ کے ذریعے الیکٹران کا ہیولا نظر آجاتا ہے۔ دوربین کا عدسہ نگاہوں پر فٹ ہو جائے تو دور دراز کی چیزیں قریب نظر آنے لگتی ہیں جس قسم اور جس طاقت کا لینس آنکھوں پر لگ جائے اس مناسبت سے اَن دیکھی چیزیں مشاہدہ بن جاتی ہیں۔

روحانیت آدمی کی دو مادی آنکھوں کے علاوہ ایک اور نگاہ کا تذکرہ کرتی ہے۔ یہ نگاہ گوشت پوست کی دو آنکھوں پر انحصار نہیں کرتی اور اس کا دائرہ عمل مادی آنکھوں کی نسبت لامتناہی ہے۔ یہ نگاہ روحانی علوم میں مشاہدے کے ذریعہ یا بصارت کا لینس ہے جب یہ نگاہ کام کرتی ہے تو نگاہ پر غیب بینی کا لینس فٹ ہو جاتا ہے غیب میں کیا حرکات ہو رہی ہیں وہ نگاہ کے سامنے آجاتی ہیں آدمی چھپی ہوئی چیزوں کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اشیاء کے باطنی خدو خال نظر آجاتے ہیں یہ نگاہ ٹائم اور اسپیس کے دائروں میں جہاں چاہے بہ یک وقت لمحات کا احساس ہوئے بغیر دیکھ لیتی ہے۔

مادی حواس یا شعوری حواس میں ہم گوشت پوست کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اگر آنکھیں بند کر لی جائیں تو وہ اطلاعات جو روشنی کے ذریعے پردہ بصارت تک پہنچتے ہیں رُک جاتی ہیں اور ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ مادی آنکھوں کا عمل ہے جسے ظاہری بینائی بھی کہا جاتا ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دیکھنے کے لیے صرف آنکھوں کا ہونا کافی نہیں ہے اگر اعصاب کو وہ نظام حذف کر دیا جائے جو بصارت کے پردے سے اطلاع دماغ تک پہنچاتا ہے تو آنکھ کے موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بصارت کے میکانزم میں آنکھیں جزو ہیں کل نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص سویا ہوا ہے اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن وہ ماحول کی چیزوں کو دیکھ نہیں سکتا روشنی، آنکھیں اور دماغ کا اعصابی نظام سب کچھ موجود ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

روزمرہ زندگی میں یہ بات مشترک ہے کہ مناظر کو دیکھتے وقت یا مناظر کے عکس کو محسوس کرتے وقت ہماری مادی آنکھوں کا عمل دخل صفر ہوتا ہے بتانا یہ مقصود ہے کہ انسانی نگاہ اپنے عمل میں مادی عوامل کی احتیاج سے آزاد ہے۔ ایک طرز میں وہ مادی آنکھ کے وسیلے سے حرکت کرتی ہے اور دوسری طرز میں اس کا عمل مادی آنکھوں کے عمل سے ماورا ہے نگاہ کا وہ رُخ جو مادی آنکھ کے بغیر کام کرتا ہے باطنی نگاہ اندرونی نظر یا دیدِ دوست ہے۔ روحانی علم کی روشنی میں آدمی کی تعریف بیان کی جائے تو اس کو نگاہ کا نام دیا جائے گا اور نگاہ کا دارومدار اطلاعات پر ہے اطلاعات ذہن میں آتی رہتی ہیں اور ذہن میں آکر نگاہ بن جاتی ہیں

خیال، ادراک، تصور، حافظہ، بصارت ظاہری و باطنی یہ سب نگاہ کی مختلف شکلیں یا مختلف درجات ہیں اور انہی کے مظہر کا نام انسان اور انسانی زندگی ہے۔ اس حقیقت کو مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ آدمی نگاہ ہے۔ گوشت پوست مفروضہ (FICTION) ہے اور نگاہ یہ ہے کہ آنکھ دوست (اللہ) کی تجلی کا مشاہدہ کرتی رہے۔

## روح سے دوری

محمد فاروق

سوال: ہر ماہ روحانیات پر مشتمل مضامین کا ایک عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ بلا شبہ یہ سلسلہ اس کمر توڑ مہنگائی میں پریشان حال لوگوں کو مفت علاج کے مصداق اور الٰہیت کا حامل ہے۔ ادارے کے کارکنان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آلام و مصائب کے دور میں مایوس اور لاعلاج مریضوں کے لیے اللہ کی مخلوق کی خدمت کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ آدمی جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس کا سہارا صرف اللہ رہ جاتا ہے۔ اور جب اللہ کے نام کا سہارا لیا جاتا ہے تو مایوسیاں دم توڑ دیتی ہیں۔

آپ نے قارئین کو یہ بتایا ہے کہ آدمی جب اپنی روح سے دور ہو جاتا ہے تو وہ الجھنوں، پریشانیوں، اعصابی کشمکش اور نت نئی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آدم اپنی روح سے کس طرح دور ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کی زندگی روح کے تابع ہے۔ آدمی زندہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کا رشتہ روح کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس بات کی بھی علمی توجیہہ فرمائیں کہ طب روحانی میں، امراض کی کیا حیثیت ہے اور امراض کی تشخیص کس طرح کی جاتی ہے؟

جواب:۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ باہر نہیں دیکھتے، کائنات کا ہر مظہر ہمارے اندر موجود ہے جب تک کسی شے کا عکس ہمارے دماغ پر نہ پڑے ہم اس شئے کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ ہمارے سامنے موجود ہے، حالانکہ باہر کوئی چیز قیام پذیر نہیں ہے۔ ہم ہر چیز کا مشاہدہ اپنے اندر کرتے ہیں اور یہ سب کا سب علم ہے۔ اگر کسی شے کا علم ہمیں حاصل نہ ہو تو ہم اس چیز کو نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ ہم اپنے اندر دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں باہر دیکھ رہے ہیں۔ یاد رکھئے ہماری بھی کوئی خارجی شے نہیں ہے اس کا وجود بھی ہمارے اندر ہے بالکل یہی حال صحت کا ہے۔

اس حقیقت سے ایک فرد واحد بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی زندگی میں غم اور خوشی کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات پر قائم ہے۔ کوئی خیال ہمارے لیے مسرت آگیں ہوتا ہے اور کوئی خیال انتہائی کربناک، ڈر، خوف، شک، طمع، نفرت و حقارت، غرور و تکبر، خوش نمائی وغیرہ سب خیالات کی پیداوار ہیں۔ اس کے برعکس محبت ایثار، یقین، انکساری اور حزن و ملال کا نہ ہونا بھی خیالات کی کارفرمائی ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال بجلی کی طرح کوند جاتا ہے کہ ہماری اولاد کے ساتھ حادثہ پیش نہ آ جائے جیسے ہی خیال کہ یہ رو دماغ سے ٹکرائے گی حادثے سے متعلق پوری پریشانیاں کڑی در کڑی آدمی اپنے اندر محسوس کریگا اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ یہی حال خوشی اور خوش آئند زندگی کا ہے۔ جب انسانی تصورات ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں جن میں خوشی اور شادمانی کی تصویریں موجود ہیں تو انسان خوش ہو جاتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ خوشی اور غم دونوں تصورات سے وابستہ ہیں۔ اور تصورات خیالات سے جنم لیتے ہیں۔ اب یہ تلاش کرنا ضروری ہو گیا کہ خیالات کیسے اور کہاں سے آتے ہیں۔ قانون تخلیق کے تحت انسان تین پرتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک پرت صفاتی ہے اور دوسرا ذاتی تیسرا پرت ذاتی اور صفاتی پرتوں کے درمیان امتیازی خط کھینچنے والی ایجنسی کو تخلیط یا جسدِ خاکی کہتے ہیں۔ تخلیط اس ڈھانچہ اور خاکی پتلے کا نام ہے جس کو آدمی کہا جاتا ہے۔ ہر پرت کے محسوسات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں اور نمایاں امتیاز رکھتے ہیں۔ ذات کا پرت وہ تمثل ہے جو وہم اور خیال کو بہت قریب سے دیکھتا ہے۔ سمجھتا اور

محسوس کرتا ہے۔ صفات کا پرت وہ تمثل ہے جو وہم اور خیال کو تصور بنا کر جسد خاکی کو منتقل کر دیتا ہے۔ جسدِ خاکی تصورات کو معنی پہنا کر خوشی یا غم کا مفہوم دیتا ہے۔ اگر اس کو ایسی معلومات فراہم کی جائیں جن کا تعلق کسی خوبصورت باغ سے ہو تو اس کے اندر رنگین لہریں رنگین روشنیاں خوشبو کے طوفان اور حسن کے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں اور اگر ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو کسی حادثے سے متعلق ہوں تو اس کے اندر رنگین روشنیوں کی جگہ تاریکی، اور خوشبو کی جگہ بدبو، حسن کی جگہ بدصورتی، خوشی کی جگہ غم، امید کی جگہ مایوسی اور محبت کی جگہ نفرت جیسے رجحانات رونما ہونے لگتے ہیں۔

قدرت نے اس ایجنسی کو غیر جانبدار بنایا ہے اس تمثل یا ایجنسی میں دو قسم کے نقوش ہوتے ہیں۔ ایک نقش باطن جس میں لطیف انوار کا ذخیرہ رہتا ہے اور دوسرا نقش ظاہر جس کے اندر غرض پسندی، حسد، ذہنی تعیش، احساس کمتری، تنگ ظرفی اور غیر ذمہ داری جیسے جذبات کا ذخیرہ رہتا ہے۔ تصورات میں اگر پیچیدگی اور بناوٹ ہے تو یہ تمثل ان کو ظاہر نقش میں پھینک دیتا ہے وہاں یہ تصورات الجھن پریشانی اور اضطراب کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ یہی عالم سفلی، عالم ناسوت اور عالم آب گل کے محسوسات اور خواہشات ہیں۔ عالم سفلی کے محسوسات اور خواہشات کی افراط اس تمثل کو نقشِ باطن سے دور کر دیتی ہے۔

جیسے ہی یہ دوری واقع ہوتی ہے۔ اس تمثل میں خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ یہ خراشیں اخلاقی امراض کی بنیاد ہیں۔ ان خراشوں سے غرض پرستی حرص اور اسی قبیل کے دوسرے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ دیوانگی اور کفر اسی تمثل کے متاثر ہو جانے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ روحانی زبان میں تمثل اس تصویر کو کہتے ہیں جس میں فہم کے ساتھ حرکت پائی جاتی ہے۔

باطنی نقش کی بیگانگی سے تمثل میں ایک متعفن پھوڑا ہو جاتا ہے اس کی سڑاند جیسے جیسے بڑھے گی صفاتی پرت کی اس دوری سے انسان کے اندر مرگی، دماغی فتور، آسیب، مالیخولیا، خفقان، بھگندر، کینسر، بواسیر، دق اور نگاہ سے محرومی جیسے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

عرف عام میں رگ، پٹھوں کی بناوٹ اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو انسان کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ وہ انسان نہیں ہے۔ جسے قدرت انسان کہتی ہے۔ اس انسان کو ہم اصل انسان کا لباس کہہ سکتے ہیں۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے اندر کسی قسم کی حرکت نہیں ہوتی۔ اس جسم کو گھسیٹا جائے۔ اس کے کسی عضو کو کاٹا جائے کچھ بھی کیا جائے۔ جسم کی طرف سے اپنی کوئی مدافعت یا حرکت نہیں ہو گی۔ اس میں کسی بھی لمحے زندگی کو کوئی شائبہ پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے۔

آپ ایک قمیض لیجئے۔ اگر آپ چاہیں کہ قمیض جسم سے الگ بھی حرکت کرے۔ تو یہ ممکن نہیں ہے جب تک قمیض جسم کے اوپر ہے جسم کی حرکت کے ساتھ اس کے اندر بھی حرکت موجود ہے۔ اگر آستین ہاتھ کے اوپر ہے۔ تو اس کے اندر ہاتھ کی حرکت کے ساتھ حرکت کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ہاتھ سے الگ آستین کی حرکت بعید از قیاس ہے۔ بعینیہ یہ ہی حال جسم کا ہے اگر جسم کسی دوسرے جسم کے اوپر موجود ہے تو اس کے اندر حرکت ہے ورنہ جسم کی حرکت معدوم ہو جاتی ہے۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ تخلیطی جسم آدمی نہیں ہے، بلکہ آدمی کا لباس ہے۔ جس طرح لباس سے اپنی کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ اس طرح روح کے بغیر آدمی کے اندر بھی کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ روح جیسے ہی اس لباس سے تعلق منقطع کر لیتی ہے (جس کو ہم مرنا کہتے ہیں) آدمی ایک بے حس و حرکت لاش میں منتقل ہو جاتا ہے۔

طب روحانی میں۔ امراض کی تشخیص کا قانون یہ ہے کہ صاحب روحانیت (اللہ نور السمٰوات والارض)۔ (اللہ سماوات اور ارض کی روشنی ہے) کے علم سے واقف ہو، وہ یہ جانتا ہو۔ کہ لہروں کی مقداروں میں کمی و بیشی سے آدمی کے اندر کس قسم کی ٹوٹ پھوٹ واقع ہوتی ہے اور لہروں کا عدم توازن کس طرح بحال کیا جاتا ہے۔

سائنس کے تجربات اور نتائج کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ سائنسی علوم کی بنیاد کیا ہے۔اور ان سے نتائج کس طرح اخذ کیے جاتے ہیں۔

کسی علم کو جاننے کے لیے اور سمجھنے کے لئے حواس کا دخل ہوتا ہے۔ حواس نہ ہوں تو انسان کوئی علم سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نتیجہ نکال سکتا ہے۔

حواس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو حواس کی درجہ بندی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ایک درجے میں حواس محدودیت کے دائرے میں کام کرتے ہیں اور دوسرے درجے میں حواس کی وسعت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہم اسے لامحدود کہنے پر مجبور ہیں۔

ارسطو کے زمانے سے لے کر گزشتہ صدی کے وسط تک لوگ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ حیات، جاندار مادوں کے علاوہ بے جان چیزوں سے مل کر بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ارسطو نے اپنی کتاب ہسٹوریا انیمالیم(HISTORIA ANIMALIUM) میں لکھا ہے کہ عام طور پر مچھلیاں انڈوں سے پیدا ہوتی ہیں لیکن ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو ایک خاص ماحول کے تحت کیچڑ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ارسطو کے بعد دو ہزار سال تک یہ نظریہ مانا جاتا رہا لیکن سائنسدانوں کے مشاہدات اور تجربات اس نظریے کو ثابت نہیں کرسکے۔اس لیے انہوں نے اس نظریے کو مسترد کر دیا۔

پھر دوسرا نظریہ جسے حیات سے حیات کا نظریہ(BIOGENESIS) کہا جاتا ہے اپنا لیا گیا۔اس نظریے کے مطابق حیات کبھی غیر جاندار چیزوں سے مل کر پیدا نہیں ہو سکتی لیکن یہ بات بھی مکمل نہیں ہے اس لیے فوری طور پر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیات پہلی بار کس طرح وجود میں آئی۔

کیمیا(CHEMISTRY) کی تاریخ میں قانون بقائے مادہ ایک اہم مقام رکھتا ہے۔اس قانون کی رو سے مادہ کسی بھی کیمیائی تعامل( CHEMICAL REACTION) کے دوران نہ تو پیدا کیا جاتا ہے اور نہ ہی فنا کیا جاسکتا ہے۔ عرصے تک اس نظریے کو مانا اور تسلیم کیا جاتا رہا۔ ہر نامور سائنسدان نے اس نظریے کو صحیح ثابت کیا۔ لیکن ایک وقت آیا جب مشہور سائنسدان آئن اسٹائن نے یہ ثابت کیا کہ مادہ فنا کیا جاسکتا ہے۔ آئن اسٹائن کے نظریئے کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مادے کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہو جائے تو اس وقت مادہ توانائی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔آئن سٹائن نے یہ بھی بتایا کہ حرکت کے دوران اجسام کی رفتار کے مطابق ان کی کمیت(MASS) میں کمی ہوتی رہتی ہے۔اس کے باوجود آئن سٹائن نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے کوئی تجربہ یا مشاہدہ پیش نہیں کیا۔ نظریہ اضافیت( THEORY OF RELATIVITY) کو ہر سائنسدان نے تسلیم کیا۔

یہ کہانی ہے آج کے دور کے علوم کی۔ جن علوم کی بنیاد پر بے پناہ ترقی ہوئی ہے اور اس بے پناہ ترقی میں تعمیر کم اور تخریب زیادہ ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسا فارمولا ہے جس کو بنیاد بنا کر ہم اس حقیقت تک پہنچ سکیں کہ حیات کیا ہے جس کو مسترد نہ کیا جاسکے۔دنیا کی تعمیر جن حواس پر قائم ہے اس کی حیثیت مفروضہ ہے۔اس لئے کہ حیات کے بارے میں ہر نظریہ کچھ عرصے کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے یا مسترد کر دیا جاتا ہے۔

حیات کی چھان پھٹک کرنے کے بعد تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ حیات جن حواس پر قائم ہے وہ دو قسم کے ہیں۔ایک طرح کے حواس مفروضہ ہیں اور دوسری طرح کے حواس یقینی ہیں۔ مفروضہ حواس میں قدم قدم پر پابندی ہے اور یقینی حواس میں پابندی نہیں ہے حیات کا تعلق یقینی حواس پر ہے اس لئے کہ مفروضہ حواس بذات خود مفروضے(FICTION)پر قائم ہے۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا یاایک قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھاناخوداس بات کی علامت ہے کہ جس جگہ ہم موجود ہیں اس کے علاوہ دوسری کوئی جگہ ایسی ہے جس کے اوپر زندگی رواں دواں ہے حیات سے حیات پیدا ہوتی ہے اس نظریے کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ بات توجہ طلب بن جاتی ہے کہ حیات سے پہلے کیا تھااور حیات ہر لمحے کے بعد کہاں غائب ہو جاتی ہے۔

میری زندگی کا ہر لمحہ حیات ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے لمحے میں پہلا لمحہ مر جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اب ہم یوں کہیں گے کہ جس طرح حیات کو امر مسلمہ سمجھا جاتا ہے اسی طرح فنا بھی ایک حقیقت ہے یعنی حیاتیاتی قانون یہ بنا کہ حیات سے حیات نہیں پیدا ہو رہی ہے بلکہ فنا سے حیات اور حیات سے فنا تخلیق ہو رہی ہے۔اس طرح بھی بیان کیا جائے گا۔ فنا اور حیات دونوں ایک حقیقت ہے۔۔۔۔۔جب ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ فنا اور حیات دونوں زندگی ہیں۔۔۔۔۔تو ہمارے اوپر ایک نیا انکشاف ہوتا ہے کہ فنا ہی دراصل حیات ہے۔ میری آج کی زندگی کے ایک لمحے پر فنا وارد نہ ہو تو میں اگلے مرحلے میں داخل نہیں ہو سکتا اور آج کا پیدا ہونے والا بچہ کبھی پنگوڑے میں سے باہر نہیں آئے گا۔

حیاتیاتی سائنسدانوں نے اب تک جو کچھ بھی کہا ہے وہ فنا سے حیات اور حیات سے فنا کے نظریے کے مطابق نہیں ہے مثال: ہم مادی جسم کے ساتھ پیدا ہوئے۔مادی جسم کے ساتھ نشوونما پا کر جوان ہو گئے اور مضبوط اعصاب پر بڑھاپا طاری ہوا۔۔۔۔۔اور پھر ہم نابود ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ ایک دن کے بچے،ایک سال کے بچے،اٹھارہ سال کے جوان اور ساٹھ سال کے بزرگ کی حیات کو کون نگل گیا؟ وہ کہاں روپوش ہو گئی؟ کیوں روپوش ہو گئی؟۔۔۔۔۔یہ کیوں ضروری نہیں ہے کہ ہم ساٹھ سالہ تجرباتی زندگی کو تلاش کریں؟؟؟؟؟؟؟ساٹھ سال جس کے:

اکیس ہزار نو سو۔۔۔۔۔دن

پانچ لاکھ پچیس ہزار چھ سو۔۔۔۔گھنٹے

تین کروڑ پندرہ لاکھ چھتیس ہزار۔۔۔۔۔۔منٹ

اور ایک ارب نواسی کروڑ اکیس لاکھ ساٹھ ہزار۔۔۔۔۔سیکنڈ

ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا طویل وقفہ ہم نظر انداز کر دیں۔

سائنسدانوں کے نظریات کی روشنی نوع انسانی کو یہ بتانے سے قاصر ہے کہ حیات کیا ہے۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ سائنسی نظریہ یا تو تبدیل ہو جاتا ہے یا مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کسی نظریے کو ہم اس وقت حقیقی نظریہ کہہ سکتے ہیں جب وہ تبدیل نہ ہو اور نہ ہی کوئی اسے مسترد کر سکتا ہو۔حیات سے متعلق نہ تبدیل ہونے والا اور کسی بھی صورت میں جس نظریئے کو مسترد نہ کیا جا سکتا ہو، کی نشاندہی سائنس کی سب سے بڑی کتاب قرآن نے کی ہے ۔۔۔۔۔فلسفہ حیات بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

حیات دو طرح کے حواس پر قائم ہے۔ایک طرح کے حواس مفروضہ ہیں۔ان حواس میں جب بھی کوئی فیصلہ کیا جائے گا مفروضہ اور فکشن ہو گا۔اور بالآخر اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔

دوسری طرح کے حواس یقینی ہیں۔ ان حواس میں جب بھی کوئی فیصلہ کیا جائے گا یا نتیجہ مرتب کیا جائے گا ان میں کسی عنوان میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ جسے نوع انسانی بقا کہتی ہے۔ وہ سب فکشن اور مفروضہ حواس کی درجہ بندی ہے۔ فی الواقع حیات کی اصل فنا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ زندگی فنا سے نکلتی ہے اور فنا زندگی بن جاتی ہے۔۔۔۔۔

سائنس کا یہ کہنا کہ حیات کبھی غیر جاندار چیزوں سے مل کر پیدا نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ مفروضہ حواس کی کار فرمائی ہے۔۔۔۔ اس لیے کہ مشاہدات یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات میں کوئی وجود بغیر زندگی کے موجود نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ حقیقی حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ پہاڑ میں بھی زندگی ہے۔ پہاڑ بھی اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح دوسری مخلوق پیدا ہوتی ہے جب ہم سائنسی فارمولوں کی بڑی اور آخری کتاب کلام مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو تخلیق کائنات کے سب سے بڑے سائنسدان اللہ نے اپنے نائب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھوایا ہے۔

ہم نے اپنی امانت و نیابت کے فارمولے، سماوات اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کئے سب نے متفقہ طور پر اللہ کی آواز سن کر اور امانت کی توانائیوں کے قانون کو جان کر کہا۔۔۔۔ ہم اس بار کے مستحق نہیں ہو سکتے اور اگر ایسا ہو گیا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔۔۔۔ ہر بالغ اور باشعور دانشور یہ سمجھتا ہے کہ انکار بالآخر اور بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ۔۔۔۔۔

انکار کرنے والی ہستی یا اقرار کرنے والی شے میں عقل و شعور موجود ہے۔ عقل و شعور کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی قدروں سے بھی واقف ہے اس کو اس بات کا علم ہے کہ میری جان ناتواں (حیات) نے اس عظیم امانت کو اٹھا لیا تو میری جان (حیات) ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔

اب یہ کہنا کہ کائنات میں کوئی شخص بغیر حیات کے بھی موجود ہے، دلیل کے ساتھ سائنسی نظریے کی نفی ہے۔ حیات ممات، فنا اور زندگی کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم سائنسی دستاویز کی مکمل اور آخری کتاب قرآن سے رجوع کریں۔

انسان قدرت کاایک ایسا سربستہ راز ہے جو فطرت کے انمول خزانوں سے مالامال ہے۔ اب اسے خود اپنی ذات کی ستم ظریفی کہاجائے یا نفس کی کمزوری کہ مخلوق میں سب سے زیادہ تونگر ہوتے ہوئے بھی مفلسی کی دھجیاں گلے میں لٹکائے پھرتا ہے۔ خزانوں کی کنجیاں ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی درِ دولت کو مقفل رکھتا ہے خود اپنے ہی جھوٹے خول میں بند ہو کر اپنی ذات کو پراسرار بنالیتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر تو غیر خود اپنی نظر بھی اپنی ذات کو پہچان نہیں پاتی۔ انسانوں کے اس جنگل میں ہر شخص مختلف لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ نرم ملائم لباس جسم کو آرام و فرحت بخشا ہے اور سخت اور کھردرا لباس باعث تکلیف بن جاتا ہے۔ انسان کی طبیعتوں اور مزاجوں کے یہ مختلف لباس بھی اس کی ذات کو کبھی راحت و سکون بخشتے ہیں۔ اور کبھی ناامیدی اور عدم تحفظ کے جہنم میں سپھینک کر بے آرام کر دیتے ہیں۔ آدم فطری طور پر راحت و سکون عیش و آرام کا دلدادہ ہے۔ یہ فطری تقاضہ ابھر ابھر کے اس کے نامساعد حالات کو بدلنے کے لیے مجبور کرتا رہتا ہے۔ دراصل ہر خیال اور ہر شے کے دو رخ ہیں۔ اگر ایک رخ حواس کی سطح پر ہوتا ہے تو دوسرا رخ حواس کی گہرائی میں ہوتا ہے۔ ایک رخ نیگیٹو ہے تو دوسرا رخ پوزیٹو ہے۔ خیال روشنی ہے جس میں اطلاع ہے۔ یعنی ذہن کی ایک فکر ہے۔ یہ روشنی حواس کی سطح سے گہرائی تک اور گہرائی سے سطح تک سفر کرتی ہے اور ذہن انسانی حواس کے دائرے میں ان روشنی کی کیفیات کو محسوس کرتا ہے۔ فکر کی روشنی کا نیگیٹو رخ جب حواس کی سطح پر آجاتا ہے تو آدمی اس فکر کے نیگیٹو رخ سے متعارف ہوتا ہے۔ نیگیٹو رخ تخریبی رخ ہے۔ اس رخ کے مظاہرے میں آدمی محرومی، بے سکونی، بے آرامی، اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔ فکر کی روشنی جب اپنا پازیٹو رخ ڈسپلے کرتی ہے تو حواس اس رخ میں فکر کے تعمیری پہلو سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور حواس کے دائروں میں فکر کی روشنی مستقل طور پر جذب ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے قلب و ذہن توانائی محسوس کرتا ہے۔ یہی توانائی آدمی کو فرحت و آرام بخشتی ہے۔ نیگیٹو رخ میں روشنیاں حواس کے دائروں میں جذب ہونے کے بجائے واپس لوٹ جاتی ہیں۔ ان کے دباؤ سے دماغ کے خلیے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ دماغ کے خلیوں میں روشنی کی مقداروں کی کمی بیشی کی وجہ سے انسان کے اندر یقین کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ ناامیدی، احساس کمتری اور شک وشبہ کا شکار ہو جاتا ہے۔

ساری کائنات روشنیوں اور توانائیوں کے ایک نہایت ہی مربوط نظام کے ساتھ قائم ہے۔ ہر شے میں توانائی کی متعین مقداریں کام کر رہی ہیں۔ انہی متعین مقداروں کے ساتھ شے کا وجود قائم ہے اور توانائی کی متعین مقداریں اس کے جسمانی و روحانی نظام کو کو برقرار رکھتی ہیں۔ آدمی تقاضوں کا مجموعہ ہے اس کے اندر مسلسل تقاضے ابھرتے رہتے ہیں۔ انہیں تقاضوں کی تکمیل زندگی کی حرکت ہے۔ زمین پر آدمی وسائل کا پابند ہو کر زندگی گزار رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ خاندان اور گروپ میں رہ کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں معاشرتی طرزوں کا عمل دخل ہے اکثر اوقات ظاہری رسم و رواج اور معاشرتی طرزوں کا عمل دخل آدمی کے تقاضوں کی کامیابی کے لیے سدِ راہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی ناکامیاں اور محرومیاں ارادے کو پست کر دیتی ہے۔ اور اس کی قوت ارادی کم ہو جاتی ہے۔ آدمی کا ارادہ ہی وہ قوت ہے۔ جو خیال یا ذہن کی فکر کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ یعنی ارادہ کی قوت ہی ذہن کی حرکت بنتی ہے۔ جو خیال کی تصویر کو ذہن کے پردے سے کھینچ کر سامنے حاضر کر دیتی ہے۔ تب آدمی اپنی مطلوبہ شے حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوت ارادی کا فقدان آدمی کے تقاضوں کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو آدمی کے اندر قوت ارادی کو گھٹاتے اور بڑھاتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ تقاضوں کی زیادہ سے زیادہ تکمیل آدمی کے اندر قوت ارادی کو بڑھاتی ہے اور تقاضوں کی زیادہ سے زیادہ ناکامی آدمی کے اندر قوت ارادی کو پست بنا دیتی ہے۔ یہاں تقاضوں کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ تقاضوں سے ہماری مراد جبلت نہیں ہے۔ اگرچہ جبلت بھی فطری تقاضے ہیں۔ مگر جبلت حیوانیت کا دائرہ ہے۔ یہاں

تقاضوں سے مراد وہ بشری تقاضے ہیں جو انسانیت کے دائرے میں آتے ہیں۔ ہر نوع کی ایک خاص فطرت ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ فطرت اس کی زات سے الگ نہیں کی جاسکتی۔ جیسے شیر میں درندگی کی صفت ہے۔ ہزار اسے سدھایا جائے گا وہ بلی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی فطرت کا خاص نظام کام کر رہا ہے۔ آدمی کی ہر حرکت فطرت کے اسی نظام کے دائرے میں ہے۔ فطرت کے دائرے سے ہٹ کر کوئی بھی حرکت شخصیت کو توڑ مروڑ دیتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ساری کائنات یقین کے اوپر چل رہی ہے۔ یقین کے بغیر ہم کوئی حرکت نہیں کر سکتے ہم زمین پر قدم بڑھاتے ہیں تو غیر ارادی طور پر ہمارے ذہن میں یہ موجود ہوتا ہے کہ ہمارے پاؤں کے نیچے زمین ہے۔ اگر یہ خیال نہ ہو اور یقین شک وشبہ میں بدل جائے تو ہم فوراً لڑکھڑا جائیں گے۔ غرضیکہ یقین ہی ساری کائنات کی بنیاد ہے جس کے اوپر کائنات قائم ہے۔ ہم یقین کو روشنی سے تعبیر کرتے ہیں اور شک و وسوسہ و بے یقینی کو تاریکی کہتے ہیں۔ روشنی انرجی یا توانائی ہے اور تاریکی خلا ہے۔ یہ بات اب سائنس اور روحانی طرزوں پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دنیا اور کائنات کا نظام روشنیوں سے قائم ہے۔ روشنیاں ہی کائنات کو وجود بخشتی ہیں۔ اور کائنات کی اشیاء کی نشوونما کرتی ہیں۔ اگر کائنات کے اندر سے روشنیاں نکال دی جائیں تو کائنات کا وجود مٹ جائے گا اس حقیقت کے تحت کائنات کے ذرے ذرے کو قدرت کی جانب سے روشنی مہیا کی جارہی ہے۔ ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ کیونکہ ہر شے جسم اور روح دونوں کے اشتراک کا مجموعہ ہے۔ جسم کو حرکت دینے والی ہستی روح ہے۔ یعنی باطن ہے۔ انسان کے اندر ایک مرکز ہے۔ اس مرکز کا نام قلب ہے۔ اس مرکز سے روشنیاں انرجی کی صورت میں سارے جسم کو سپلائی ہوتی ہیں۔ چونکہ باطن کے حواس ہیں۔ لہذا روشنی کا یہ مرکز ظاہری حواس و نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ البتہ دماغی تصور کے ذریعے سے اس مرکزِ روشنی کو انسان ذہن کی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے اور قلبی حواس کے ذریعے اس کی کیفیات کو محسوس کر سکتا ہے، احساس کمتری دراصل اس وقت ہوتا ہے جب قلب کے اس مرکز روشنی میں روشنی کی مقداریں نارمل مقداروں سے کم ہو جاتی ہیں قلب میں روشنی کی کمی شک اور وسوسے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب آدمی کے اندر شک اور وسوسہ آنے لگتا ہے تو قلب کے اندر روشنی کے اس نقطے پر بادل کی طرح تاریکی کی تہہ جمنے لگتی ہے۔ جیسے کاربن۔ اس کاربن کی وجہ سے روشنی کی متعین مقداریں جسم کو مہیا نہیں ہو پاتیں اور اسی وجہ سے شک وسوسوں اور احساس کمتری جیسے مرض ہو جاتے ہیں۔ کاربن نیگیٹو خیالات سے بنتی ہے۔

احساس کمتری کی وجوہات کو مد نظر رکھتے ہوئے قوت ارادی (WILL POWER) بڑھانے کے لئے ذہنی ارتکاز کی کچھ مشقیں درج کی جاتی ہیں جن کے ذریعے اس بیماری سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

مشق نمبر ۱:۔ مشق شروع کرنے سے پہلے جسم کا صاف ستھرا ہونا ضروری ہے۔ غسل کر لیا جائے یا وضو کر لیا جائے اس کے بعد صاف ستھرے کپڑے پہنیں۔ کپڑے آسمانی یا سفید رنگ کے پہنیں۔ کمرہ صاف ستھرا ہو۔ ہلکی سے خوشبو کمرے میں بسالی جائے تاکہ نفسیاتی طور پر ذہن اس مشق کے لئے تیار ہو جائے۔

زمین پر صاف ستھرا کپڑا بچھا کر بیٹھیں۔ رات کا وقت ہو یا علی الصبح کا وقت ہو۔ کمرے میں بہت کم پاور کا نیلے رنگ کا بلب روشن کر لیا جائے۔ دوسری روشنی نہ ہو۔ اپنا رخ شمال کی جانب کرلیں۔ اور آرام دہ نشست میں بیٹھ جائیں۔

آہستہ آہستہ بغیر آواز کے ناک کے ذریعے گہری سانس اندر کی جانب لیں۔ ایک لمحے کو سانس پیٹ میں روکیں اور پھر منہ سیٹی کی طرح گول کر کے سانس باہر بغیر آواز کے نکال دیں۔ اسی طرح پانچ مرتبہ سانس لیں۔ پھر آنکھیں بند کر کے یہ تصور کریں کہ قلب کے اندر روشنی کا ایک نقطہ ہے۔ اس نقطے سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس روشنی سے دل منور ہو رہا ہے۔ پندرہ بیس منٹ تک یہ تصور کریں۔

ہر روز اس مشق کے لیے ایک وقت مقرر کر لیں۔ سانس کی مشق پانچ کی تعداد سے آہستہ آہستہ گیارہ تعداد تک لے آئیں۔ تصور پندرہ منٹ سے آدھے گھنٹے تک کیا جاسکتا ہے۔ چالیس دن تک لگاتار یہ عمل کریں۔ یقیناً آپ خود اپنے اندر ایک قوت محسوس کریں گے۔ قوت ارادی بحال ہوتی جائے گی۔ خود اپنی قوت ارادی کو ٹیسٹ کرنے کے لیے مشق بھی کی جاسکتی ہے۔ جیسے سگریٹ نوشی سے پرہیز کر کے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ آپ کتنے دن تک بغیر سگریٹ کے رہ سکتے ہیں۔ یا اپنی قوت ارادی کو استعمال کرتے ہوئے مستقل طور پر سگریٹ نوشی سے پرہیز کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی قسم کی کوئی غلط عادت جو آپ خود پسند نہیں کرتے۔ قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے چھوڑی جاسکتی ہیں مگر پہلے کم از کم چالیس دن تک مستقل یہ مشق کرنا ضروری ہے۔

مشق نمبر ۲:۔ اس مشق میں بھی صفائی ستھرائی کے وہی اصول کار آمد ہوں گے جو ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔

آنکھیں بند کر کے تصور کریں۔ کہ آپ آسمان کے نیچے بیٹھے ہیں۔ آسمان سے نیلی روشنیاں آپ کے سر پر آ رہی ہیں۔ دماغ کے ذریعے سے نیلی روشنیاں قلب کے اندر داخل ہو رہی ہے۔ ہ اور قلب سے یہ روشنیاں سارے جسم کے اندر پھیل رہی ہیں۔ اور پاؤں کے تلووں سے خارج ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح آپ کے سارے جسم کے اندر نیلی روشنیوں کا بہاؤ جاری ہے۔

مراقبہ کی ان دونوں مشقوں سے دماغ کے اندر روشنیوں کا بہاؤ درست ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ذہن کو مطلوبہ والٹیج یا انرجی ملنے لگتی ہے ۔ اور قوت ارادی بحال ہو جاتی ہے۔ مگر ایک وقت میں ایک ہی مشق کرنی چاہیے۔

مراقبوں کی ان مشقوں کے ساتھ اسمائے الٰہیہ کا ورد اور ذکر اذکار بھی کیا جاسکتا ہے۔ مراقبے سے پہلے سو بار درود خضری اور سو بار یا حی یا قیوم پڑھیں۔ یا 41 مرتبہ یا رحمن پڑھ کر تصور کریں اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم یا آیت پڑھنے سے مرکز روشنی یا قلب کے نقطے میں روشنی کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے تصور آسانی سے قائم ہو جاتا ہے۔

پیارے دوست

آج تم ضرورت سے زیادہ سنجیدہ کیوں ہو۔ تمھارے چہرے پر پھیکا پن اور پیشانی پر شکنیں کیسی ہیں تمھاری آنکھوں میں جھیل جیسی گہرائی کیسے پیدا ہو گئی۔ لاشعور نے شعور سے کہا۔

خدا کے عطا کردہ نور نے مجھے ہدایت بخش دی ہے۔ میں گناہوں سے محفوظ اگر نہیں ہوں تو میرا دامن کثافتوں اور آلودگیوں سے پاک ضرور ہو گیا ہے۔

نور نے میرے اوپر ظلمت کو آشکار کر دیا۔ اب میرے لیے ظلمت اور تاریکی سے بچنا آسان ہو گیا ہے اس لیے کہ تاریکی کے پس منظر میں میں نے اس روشنی کو دیکھ لیا ہے جس روشنی پر تاریکی قائم ہے۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ زندگی کا ہر لمحہ دراصل فنا ہے۔ یعنی پے در پے لمحات کی فنا زندگی ہے۔ میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ میرا وجود بالآخر مٹی کے ذرّات میں تبدیل ہو جائے گا میں نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے کہ جب تک آدمی کے اندر خود نمائی رہتی ہے خلوص پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے لباس میں سے بیجا آرائش و زیبائش کو ختم کر دیا ہے۔ لباس میں خود نمائی کی بیہودہ کوشش میں نے ترک کر دی ہے۔ لوگوں کو مخاطب کرنے کے لیے میں نے جھوٹے القاب چھوڑ دیئے ہیں۔ میں کسی کو تم سے مخاطب نہیں کرتا اور کسی کے سامنے جھکتا بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ جھکتا وہ ہے جو خودی سے واقف نہ ہو۔

لاشعور شعور کی لن ترانی دیکھ کر گویا ہوا۔

دوست! زندگی کی جو تعریف تم نے بیان کی ہے وہ ایسی تعریف ہے جس کو انسانی معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ نور اور ظلمت کا جو نقشہ تم نے بنایا ہے اس کے پس منظر میں تاریکی اور خود نمائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ خودی سے واقف ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گرامر اور لغوی بحث میں پڑ کر خود کو نجات یافتہ سمجھ لیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ماضی میں شر اور خیر کی آمیزش سے ایک نظام قائم ہوا۔ خیر نے شر کو سرنگوں ہونے کے لیے کہا تو شر نے اپنا سر پیٹ لیا اور اپنی خودی کے زعم میں دلیل یہ دی کہ خیر مٹی ہے اور شر چمکتی دہکتی ہوئی روشن آگ ہے۔۔۔۔۔ روشنی مٹی کے سامنے کیسے سَر نگوں ہو جائے؟

خیر نے دلیل پیش کی مٹی میں نمو ہے۔ مٹی میں تخلیق ہے۔ مٹی میں سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ کونپل پتّے بن جاتے ہیں۔ مٹی پنکھڑیوں سے مرکب پھول کی مہک ہے۔ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیراہن پہنے ہوئے درخت مٹی ہو جاتے ہیں۔ مٹی ماں ہے جس کی کوکھ سے مرغزار اور چمنستان جنم لیتے ہیں۔ مٹی کوئل کی کوک اور چڑیوں کی چہکار ہے۔ آگ روشنی ضرور ہے مگر مٹی کی طرح اس میں نمو نہیں ہے تخلیق نہیں ہے۔ روشن آگ مٹی کی ہر تخلیق کو جلا کر خاک اور خاکستر کر دیتی ہے شر اور خیر کی تکرار ورائے لاشعور نے سنی تو بات کا رخ ہی بدل گیا اور ائے لاشعور نے کہا۔

یہ خیر اور شر کیا ہے۔۔۔۔۔ ایک اطلاع ہے۔ اطلاع ایک ہے معنی دو ہیں۔ ایک فرد چوری کر کے روٹی کھاتا ہے۔ دوسرا شخص محنت مزدوری کر کے روٹی کھاتا ہے۔ خیر اور شر کا یہ عجیب امتزاج ہے کہ روٹی کھانا دونوں میں مشترک ہے۔ دونوں میں غذائیت بھی یکساں ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ چوری کی کمائی ہوئی روٹی کھانے سے خون کی بجائے رگوں میں پانی دوڑا ہو۔۔۔۔ یہ بھی کسی نے دیکھا نہ سنا کہ محنت مزدوری کر کے روٹی کھانے سے خون کا رنگ بدل گیا ہو۔ دونوں صورتوں میں عمل کا نتیجہ ایک ہے۔ ایک آدمی ظلمت کو پسند کرتا ہے۔۔۔۔ اور چار روشنی کو۔۔۔۔ کوئی شخص جسمانی تکلیف سے ایک قسم کی لذّت محسوس کرتا ہے اگر اس کے اوپر سختی نہ کی جائے اور اس کے جسم کو مضطرب نہ کیا جائے، اس طرح کہ مرمریں جسم پر نیل نہ

پڑ جائیں تو وہ آدمی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتا۔ یہ عمل صرف دنیاوی زندگی پر ہی منحصر نہیں ہے۔ زاہدانہ زندگی گزارنے والے بھی ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اوپر نعمتوں کو حرام کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں، دنیا کی لذّتوں سے منہ موڑ کر انھیں روح کا عرفان مل جائے گا۔ دھیان گیان کرنے والوں کے گروہ نے یہ روش اختیار کی کہ خود کو بھوکا رکھا اور قدرت کی بنائی ہوئی خوبصورت مورتی کو آزار دینے کی منطق کی موٹے سوت اور کھردرے کپڑے پہنے۔ زیادہ چبھنے والے حصّے کو اندر کی طرف رکھا تا کہ جسم تکلیف کی لذّت سے آشنا رہے۔ فوم کے گدّوں اور نرم روئی کے بستر کی بجائے موٹے بان کی چارپائی اور لکڑی کے تخت پر چبھنے والی چٹائی بچھا کر اس پر آرام کیا۔ تنگ و تاریک کمرے کو اپنا مسکن بنایا۔۔۔۔۔ جسمانی شہوات سے محفوظ کرنے کے لیے اپنے آپ کو زنجیروں سے جکڑا۔۔۔۔ منوں کے حساب سے لوہے کی بھاری زنجیریں پہنیں۔ نیند سے خود کو دور رکھنے کی کوشش کی شیر کی فیاضی سے خود کو محروم کرنے کے لیے گوشت خوری سے پرہیز کیا۔۔۔۔vegetarian بن گیا۔ ننگے پیر میلوں سفر کیا۔ کسی نے زہد کو ڈاڑھی میں محدود کر دیا۔ اور کسی نے جینو گلے میں ڈال کر خود نفسی کے جذبات کو فنا کرنے کے لیے مالا جپی۔ کسی نے رہبانیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور کسی نے شادی کے فطری رجحان کو مذہب کی چوکھٹ پر قربان کر دیا۔

زمان و مکان کی پابندی سے آزاد ورائے لاشعور نے شعور سے سوال کیا۔ مذہب کے ساتھ جو آمیزش کی گئی ہے۔ اور مذہب میں جو راہیں متعین کی گئی ہے۔۔۔۔ کیا یہ سب انسانوں کے لیے راہ نجات ہے؟

اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مذہب کے اجارہ داروں نے مذہب میں اتنی تقسیم کر دی ہے کہ اب مذہب میں امتیاز کرنا ایک لاینحل مسئلہ بن گیا ہے۔

ذوق جیسا شاعر بھی ایک حقیقت کو ہزاروں روپ میں تبدیل کرنے کے عمل سے چیخ اٹھا اور کہا۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

انسان مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت اور مزاج میں اختلاف ہوتا ہے۔ ہر انسان یکساں حالات میں زندگی بسر نہیں کر سکتا منصب اور وظائف میں الگ الگ تعیّنات ہوتے ہیں۔۔۔۔ کیا یہ تجرباتی اور مشاہداتی بات نہیں ہے کہ کوئی شخص خشک مزاج اور سخت گیر ہوتا ہے۔ اتنا سخت گیر کہ سختی ختم کرنے کے لیے زندگی کی طرزوں میں تبدیلی ضروری ہو جاتی ہے۔ اور کوئی فرد اتنا نرم طبیعت ہوتا ہے کہ اس کے اندر سختی کا ہونا امرِ لازم بن جاتا ہے۔

لاشعور نے حیرت زدہ شعور کی طرف دیکھا۔

شعور نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ میرے حسیات کا اصل یہ ہے کہ میں پر سکون رہنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ الگ الگ حرفوں سے لفظ بنتے ہیں اور الفاظ کی ترکیب سے فقرہ بنتا ہے۔ اور کڑی در کڑی فقروں کی زنجیر مضمون بن جاتی ہے مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ میرے وجود کا ہر لمحہ فنائیت کے راستے پر گامزن ہے جب کہ جبلّی تقاضوں سے مرکب انسان فلاح اور کامرانی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہر لمحہ فنا کا روپ ہے تو اطمینان کیسے حاصل ہو۔ فنا ہو جانا۔ فنا ہو جانا میرے وجود کا آغاز اور میرے وجود کی آخری انتہا ہے لاشعور نے اس فلسفیانہ اور عقلی توجیہہ کے ساتھ شعور کی گفتگو سن کر کہا۔۔۔۔ یہ تسلیم کہ ہر لمحہ فنا ہے۔ شر بھی فنا ہے، اور خیر فنا کے پردے میں چھپ جاتا ہے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ خیر اور شر دونوں طرز کے لوگ فنا کی منزل میں داخل ہو کر خود فراموشی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ مگر جو اطمینان جدّ وجہد، تزکیہء نفس، خیر کے انتخاب اور پاکیزہ ذہنی انقلاب کے بعد ہوتا ہے وہ ایسا سرمایہ ہے جس کا شروع و آخر، ابتداء اور انتہا سلامت روی اور سکون قلب ہے۔ انسان جب شر پر فتح حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اندر بصیرت پیدا ہو جاتی ہے اور عالمین کی روشنی اس کے لیے محکوم بن جاتی ہے۔

ہر آدمی اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے اس کا مقام ماں کا پیٹ ہے اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہر بچہ چاہے وہ غریب ہو، فقیر ہو، بادشاہ ہو، کمزور ہو یا طاقتور ہو اس قانون کا پابند ہے کہ اس کی نشو و نما 9 ماہ تک ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ نشو و نما سے مراد یہ ہے کہ سفید چنے کے برابر بچہ ہر روز بڑھتا رہتا ہے۔ سفید چنے کے برابر بچہ میں ریڑھ کی ہڈی بنتی ہے، ہاتھ پیر بنتے ہیں، دماغ بنتا ہے، دل پھیپھڑے، جگر اور گردے بنتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ قدرت ماں کے پیٹ میں پیدائش تک بچہ کو وسائل فراہم کرتی رہتی ہے۔ جب بچہ زمین پر مظاہراتی قیام کرتا ہے تو قیام کا دارو مدار اس حقیقت پر ہے کہ پیدائش سے پہلے قدرت نے زمین کو بچھونا بنادیا ہے۔

ہم زمین پر گھر بناتے ہیں اور گھر میں آسائشوں و آرام کا سامان اکٹھا کرتے ہیں۔ یہ سامان بھی زمین کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔

لکڑی، لوہار، ڈرائی فروٹ، سیب، انگور، امرود، انار، تربوز، خربوزہ۔۔۔۔۔۔ دوسرے بے شمار پھل اور خوردونوش کی ہر چیز کی ماں زمین ہے۔

ہم جو نوکریاں کرتے ہیں۔ دکانیں کھولتے ہیں۔ ہمیں جو روزگار ملتا ہے وہ ہماری پیدائش سے پہلے سے موجود ہے۔ ہم کام اس وقت کرتے ہیں جب ہمارے اندر توانائی ہو۔ عقل و شعور ہمارے اندر کام کرتا ہو۔ اگر اللہ تعالی ہمت نہ دے، دماغ میں صلاحیت کا ذخیرہ نہ ہو، ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

ایک آدمی فرنیچر کا کام کرتا ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالی نے درخت اگادیے ہیں۔ دوسرا آدمی لوہے کا کام کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے زمین میں لوہے کی کانیں محفوظ کردی ہیں۔ تیسرا آدمی آٹے کا کاروبار کرتا ہے اللہ تعالی نے زمین کو حکم دے دیا کہ گیہوں پیدا کرے۔ قدرت نے سب کچھ مخلوق کے لئے پیدا کیا ہے اور ہر چیز مخلوق کو مفت فراہم کی جارہی ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ قدرت نے یہ نظام کیوں قائم کیا ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟

اللہ تعالی نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ اللہ کو کسی قسم کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ واحد اور یکتا ہے۔ اولاد اور ماں باپ کے رشتوں سے آزاد ہے۔ وہ خاندانی نظام سے بھی ماورا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے اتنا بڑا مربوط نظام قائم کیا ہوا ہے۔ بندے کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اسے کتنا پانی پینا ہے۔ بندہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کتنی ہوا کی ضرورت ہے۔ تفکر طلب امر یہ ہے کہ آدمی یہ بھی نہیں جانتا کہ انسانی جسم میں کام کرنے والی مشین کی قیمت تقریباً ایک کروڑ 90 لاکھ روپے ہے۔ ہر بندہ میں دل پھیپھڑے گردے وغیرہ اور ہڈیاں ہمہ وقت متحرک ہیں۔ وریدوں اور شریانوں میں خون دوڑ رہا ہے۔ اگر یہ سب مصنوعی اعضاء اور ہڈیوں کا اسٹرکچر خریدا جائے تو تقریباً دو کروڑ کی رقم بنتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے یہ سب کیوں بنایا ہے۔ انسان کے لئے سورج، چاند، ستارے اور کہکشانی نظام قائم کرنے میں کیا حکمت مخفی ہے۔۔۔؟

خود اللہ نے بتایا ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں اور انسان میری بہترین تخلیق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بہترین تخلیق انسان مجھے پہچانے۔ میرا عرفان حاصل کر کے میرے ساتھ دوستی کرے۔ میری صناعی پر تفکر کر کے اس صناعی سے مزید تخلیقات عمل میں

لائے۔ چاند، سورج، زمین، آسمان کو میں نے انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ انسان میری بادشاہت میں شریک ہو کر کر کائنات پر حکمرانی کرے۔ اس لیے کہ انسان میری بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا شاہکار ہے۔

غور کیجیے ! آپ کا نہایت خوبصورت ذہین و فطین بچہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کرتا۔ اس کے اوپر جمود طاری ہے۔ وہ خود کو عضو معطل بنائے ہوئے ہیں۔۔۔۔ کیا آپ باپ یا ماں کی حیثیت سے اس بچہ کی عدم کارکردگی سے خوش ہوں گے جبکہ آپ اپنی اولاد کی قدرت کی دی ہوئی چیزوں سے ہی پرورش کرتے ہیں؟ اور قدرت آپ کو وسائل مفت فراہم کر رہی ہے۔۔۔۔!

آپ کا جواب یقیناً یہ ہو گا، نہیں ! کوئی ماں باپ عضو معطل بچہ کی زندگی سے خوش نہیں ہوتے۔

یاد رکھیے ! یہ سارا نظام اللہ نے اپنے نائب فی الارض خلیفہ آدمی کے لئے بنایا ہے۔ اللہ نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ انسان اللہ کے دیے ہوئے اختیارات سے اللہ کے نظام کو چلائے۔ بادشاہی کے حقوق پورے کرے۔ فرشتوں، جنات، اور تمام مخلوق پر حاکم انسان جب بے بسی کے ساتھ فکر و آلام کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے تو دوسری مخلوق اس پر ہنستی ہے۔ اس کا مذاق اڑاتی ہے کہ ایک بااختیار آدمی نے خود کو کتنا بے اختیار بنالیا ہے۔

افسوس ! ماضی، حال، مستقبل اس کے لیے عذاب بن گیا ہے۔ تین سال تک محنت کے بغیر نشوونما پانے والے آدمی نے خود کو ایک روٹی کے لیے محتاج بنالیا ہے۔ اللہ نے اسے ہر قسم کے وسائل دیے۔ محبت دی اسے صحت و تندرستی دی، روزگار دیا، اولاد دی، بیوی دی اور شوہر دیا لیکن آدمی نے کبھی دینے والی ہستی کی طرف دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔

میرے دوستوں ! میرے بچو ! مجھے سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ میں اس عادت سے مجبور ہو کر آپ کو فکر کرنے اور سوچنے کی دعوت دیتا رہتا ہوں۔ مجھے بتائیں، زندگی کے ماہ و سال شمار کر کے میری راہنمائی کریں کہ ہماری اللہ سے کتنی دوستی ہے اور ہم شیطان کے کتنے وفادار ہیں۔

میری سوچ کا حاصل تو یہ ہے کہ ہماری دوستی اللہ سے دو فیصد بھی نہیں ہے۔ جب کہ ہم بانگ دہل پکارتے ہیں کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ کیا ہوا، پانی، سورج، چاند، زمین ہمارے لئے شیطان نے تخلیق کی ہے۔ کیا ہمیں اولاد شیطان نے دی ہے۔ کیا روزگار کے وسائل اس نے ہمارے لیے مہیا کیے ہیں؟

پھر کیوں ہم ابلیس کے گرویدہ ہیں۔ ہر وہ بات جو اللہ کو پسند ہے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور ہر وہ کام جو شیطان کا ورثہ ہے ہماری زندگی کی معراج بن جاتا ہے۔

میرے بچوں ! آؤ۔ میرے گرد جمع ہو جاؤ تا کہ ہم باپ بیٹے اور ماں بیٹی کے رشتے سے اپنا محاسبہ کریں کہ ہماری زندگی میں اپنے محسن اپنے خالق کی صفات کا کتنا عمل دخل ہے اور راندۂ درگاہ شیطان کس طرح ہمارے خون کے ساتھ دوڑ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔؟

کیاہم نہیں جانتے کہ انسان کا بدترین دشمن شیطان ہے۔ جو ازل سے ہی ہماری گھات میں لگ گیا تھا۔ یہ کیسی حرماں نصیبی ہے۔۔۔۔۔۔ کہ ہم نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی بات نہیں سنی جو ہمارے لئے رحمت ہیں۔ جو ہمارے لئے شفاعت کا وسیلہ ہیں اور جو ہمارے خالق اللہ کے دوست ہیں اور ہم سب کے ازلی اور ابدی خیر خواہ ہیں۔

کیاہم نے اپنے اوپر اللہ کی رحمتیں شمار کی ہیں جو پیدائش کے پہلے مرحلہ سے مرتے دم تک ہمیں حاصل رہتی ہیں؟ کبھی ہم نے سوچا ہے کہ شیطان کی طرف سے کتنی زحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ دشمنی کے کتنے جال پھینکے جاتے ہیں۔ شیطانی عمل نے من حیث القوم ہمیں اللہ سے کتنا دور کر دیا ہے۔ کیاہم دوزخ سے قریب اور جنت سے دور نہیں ہو رہے ہیں؟

میرے دوستوں! میرے لیے۔ اپنے لیے مہربانی فرما کر محاسبہ کریں۔ بچوں میں بیٹھیں بچوں سے بات کریں۔ اپنی رفیق زندگی کو سمجھائیں۔ دوستوں کی بیٹھک بٹھائیں۔ ان میں چرچا کریں کہ ہم شیطان کی دوستی میں اپنا سب کچھ برباد کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے دس آدمیوں میں میں کہی ہوئی بات کسی ایک کے دل میں اتر جائے۔ ہماری اصلاح کے ساتھ اس کی اصلاح بھی ہو جائے۔ اگر ہماری کمزوریاں دور نہ ہوئیں تو ہمیں شرمندگی ہو گی کہ ہم نے فلاں شخص کو ایک بات بتائی تھی۔ اس نے اپنی اصلاح کر لی۔ ہم کتنے بے حیا ہیں کہ خود عمل نہیں کرتے۔

آج کا دور دولت پرستی کا دور ہے۔ کوئی بھی پرستی ہو۔ اللہ واحد لاشریک کے علاوہ ہر "پرستی" شرک ہے۔ شرک ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ معاف نہیں کیا جاتا۔ میں آپ کو ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ آپ یہ بات اپنی اولادوں اور اپنی نسل کے ذہنوں میں منتقل کریں۔

"گناہ سے قومیں برباد ہوتی ہیں۔ گناہوں کی معافی ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے آدمی کے اندر احساس ندامت پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ستار العیوب اور غفار الذنوب ہے۔ وہ گناہ معاف کر دیتا ہے"

لیکن دولت پرستی۔MATERIALISM شرک ہے اور شرک معاف نہیں کیا جاتا اور قومیں جو شرک میں ڈوب جاتی ہیں ان کو اللہ کا ہولناک عذاب صفحہ ءہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، اور قوم نوح کی ہلاکت میں براہ راست شرک کا عمل دخل ہے۔

بت پرستی، سورج پرستی، آتش پرستی، دولت پرستی سب ایک طرز فکر کے مختلف نام ہیں۔

"اپنے سینے پر ہاتھ رکھئے اور بتایئے کہ دولت کے انبار میں سے کون اپنے ساتھ کیا لے کر گیا ہے۔۔۔۔۔۔؟"

ہمسفر تین دوست ریل میں سوار ایک شہر سے دوسرے کسی شہر جارہے تھے ریل کی چُھک چُھک کی آواز سے کان آشنا ہوئے تو ذہن میں خیال کی ایک گونجار پیدا ہوئی کہ چلتی ریل کیا بول رہی ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ جب کسی آواز پر ذہن ٹھہر جاتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مفہوم بن جاتا ہے۔ ہمسفر تینوں دوستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ غور کیا جائے کہ ریل کیا بول رہی ہے۔ تینوں دوست آنکھیں بند کر کے سوچ میں غرق ہو گئے، ایک صاحب جو جبل پور کے رہنے والے تھے گویا ہوئے، ریل بول رہی ہے۔ ''جبل پور کے چھ چھ پیسے، چھ چھ پیسے جبل پور کے۔''

تینوں دوستوں میں سے ایک ریاضی داں فلسفی تھے ان کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ریل بول رہی ہے ''ایک دو تین، تین دو پانچ۔ ایک دو تین، تین دو پانچ، ایک دو تین، تین دو پانچ۔''

تیسرے صاحب نے آنکھیں بند کیں تو نہیں معلوم وہ کس دنیا میں پہنچ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ ماحول سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جب ان کو جھنجھوڑا گیا تو وہ اس طرح چونکے جیسے کسی نے ان کو اوپر سے نیچے پھینک دیا ہو۔ مخمور آنکھوں میں سوچ کی شفق نمایاں تھی۔ کُھلی پیشانی پر فکر کے نقوش اُبھر آئے تھے۔ چہرے پر رنگ و نور کے دیئے جل بُجھ رہے تھے۔ ان کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسیت پیدا ہو گئی تھی کہ آس پاس بیٹھے ہوئے سارے مسافر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تینوں میں سے ایک دوست نے ان سے سوال کیا۔

''حضرت آپ کہاں گم ہو گئے۔ بات تو یہاں سے چلی تھی کہ ریل کیا بول رہی ہے۔ میرے کانوں میں ریل کی آواز کا جو مفہوم اُبھرا وہ یہ ہے کہ ریل بول رہی ہے۔ ایک دو تین۔ تین دو پانچ۔ ایک دو تین۔ تین دو پانچ۔''

یہ صاحب بولے:

میں نے جب چلتی ریل کی آواز پر غور کیا تو ریل کی چُھک چُھک چُھک چُھک کی گونجار سے دماغ کے اوپر یہ اطلاع وارد ہوئی کہ ریل بول رہی ہے۔ ''ہر چیز خود کو کھا رہی ہے۔ خود کو کھا رہی ہے ہر چیز ہر چیز خود کو کھا رہی ہے۔

ریل کی مسلسل اس آواز ''ہر چیز خود کو کھا رہی ہے، خود کو کھا رہی ہے ہر چیز'' نے مجھے کیف و سرور کی ایسی دنیا میں پھینک دیا۔ جس دنیا میں ٹائم پردہ نہیں ہے اور اسپیس فاصلہ نہیں ہے۔ مجھے وہاں دور روشنیوں کے بنے ہوئے ٹرانسپیرنٹ آدمی نظر آئے۔ ایسا دکھائی دیا کہ کھال اور گوشت کی جگہ نہایت صاف شفاف آئینہ ہے۔ اس شفاف سراپا آئینے میں جسم کے اندر ہر چیز نظر آرہی تھی۔ وریدوں اور شریانوں میں خون دوڑتا نظر آرہا تھا اور دوسرے تمام اعضاء دل، گردے، پھیپھڑے بھی پوری طرح اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ پہلے تو میں ڈر گیا، پھر کچھ ہمت بندھی تو جھجکتے ہوئے ان شفاف آئینہ آدمیوں سے میں نے پوچھا کہ ریل کیا بولتی ہے۔ ہر چیز۔ خود کو۔ کھا رہی ہے۔ خود کو کھا رہی ہے۔ ہر چیز'' وہ دونوں شفاف آئینہ آدمی مسکرائے تو میرے دماغ میں ایک جھماکا ہوا اور میں نے دیکھا کہ ان دو میں سے ایک ہاتھ کے میں یاقوت کی طرح سُرخ انار کا ایک دانہ ہے اور اس ایک دانے میں ہزارہا انار کے درخت ہیں اور ہر درخت میں لاکھوں انار لگے ہوئے ہیں۔ اور ہر انار میں اربوں کھربوں انار کے دانے ہیں۔ شفاف آئینہ آدمی کی شفاف

آئینہ ہتھیلی پر یہ یاقوتی دانہ اٹھا کر دوسرے آدمی نے زمین پر پھینک دیا۔ جیسے ہی یہ دانہ زمین پر گرا، زمین نے سیپ کی طرح اپنی آغوش کھول دی اور دانے کو اپنے اندر سمیٹ کر بند ہو گئی۔ زمین نے دانے کو اس طرح اُلٹا پلٹا کہ دانے کے اوپر موت وارد ہو گئی اور دانے کی موت کے نتیجے میں زمین کے اندر سے ایک ''کلاّ'' پھوٹا۔ پھر ان نرم و نازک پتّوں پر بھی موت وارد ہو گئی اور دانے کی موت کے نتیجے میں انار کا ایک درخت ظاہر ہو گیا۔ یہ درخت پہلے بچپن میں داخل ہوا۔ بچپن پر موت وارد ہوئی تو درخت لڑکپن اور جوانی کے درمیانی زندگی میں داخل ہو گیا اور جب زندگی کے اس مختصر حصّے پر موت وارد ہوئی تو درخت جوان ہو گیا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ بڑھاپے نے موت بن کر درخت کی جوانی کو کھا لیا۔ اور موت نے بوڑھے درخت کی لاش کو لوگوں کے چولہوں کا ایندھن بنا دیا۔

اس ماورائی انکشاف پر ماحول سہم گیا۔ قریب بیٹھے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ گویا ہوئے:

''سبحان اللہ۔ انسانی زندگی کا کیا خوب نقشہ سامنے آیا ہے، انسان جس گھڑی باپ سے ماں کے پیٹ میں منتقل ہوتا ہے اسی روز سے فنا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جرثومے فنا ہوتے ہیں تو شکل و صورت بنتی ہے۔ بچپن فنا ہوتا ہے تو آدمی جوان ہوتا ہے، جوانی فنا ہوتی ہے تو آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور بڑھاپا فنا ہوتا ہے لاش بن جاتی ہے، اور اس لاش کو قبر کھا جاتی ہے۔ ہر چیز۔ خود کو۔ کھا رہی ہے۔

ایک وقت تھا کہ آدم ذہنی سکون کے علاوہ کسی اور کیفیت سے واقف نہیں تھا۔اس کے یقین میں اتنی طاقت تھی کہ محض دل میں کسی چیز کا خیال آنے سے وہ چیز عدم سے وجود میں آجاتی تھی۔ سکون کے سمندر میں جوار بھاٹا اٹھا۔ طوفان نے سمندر کو اتنا بے چین کر دیا کہ پر سکون ٹھہرا ہوا سمندر اونچی اور بڑی لہروں کی شکل میں اپنی حدود سے باہر نکل گیا۔ حدود سے باہر کا مقام آ گیا ہے۔

جب سے دنیا بنی ہے آدم ذات اپنے کھوئے ہوئے ذہنی سکون کی تلاش میں ہے۔ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے آدم زاد نے دو راستے متعین کیے۔

۱۔ اقتصادی طور پر اپنی حالت بہتر بنانے کی کوشش۔

۲۔ کسی ان دیکھی ہستی کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کی پرستش کرنا۔

(یہی وہ نظریہ یا ضرورت ہے جس کا نام عقیدہ رکھا گیا)

اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کے لیے ہر بڑی قوم نے دوسری چھوٹی قوم کو نیست و نابود کرنے اور اپنے آپ کو دوسروں پر حکمران ثابت کرنے کے لیے خفیہ ریشہ دوانیاں کیں۔ اس طرح دوسروں کے حقوق پائمال کر کے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جب حق تلفی کا یہ سلسلہ دراز ہوا تو آدم زاد برادری کا ہر فرد حرص و ہوس کے چکر میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

ان دیکھی ہستی پر عقیدہ رکھنے کے باوجود جب پردوں میں چھپی ماورائی ہستی، آدم ذاد کے سامنے نہیں آئی تو انسانی برادری کے بزعم خود باشعور دانشوروں اور عقل مندوں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ان دیکھی ہستی کی تصویر کشی کی اور تصویر کشی کے اس مقابلے میں ایک عقیدہ ہزاروں تصویروں کے طابع مہمل ہو کر رہ گیا۔ بت پرستی شروع ہو گئی۔

ایسا اس لیے ہوا کہ گزرے ہوئے واقعات کے سلسلے میں نوع انسانی کے پاس قابل اعتماد تاریخی مواد موجود نہیں ہے۔ تاریخی بے اعتمادی نے آدم ذات کے عقائد میں ہلچل برپا کر دی۔

مذہبی رہنماؤں کے یقین سے خالی عمل نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور عوام صراط مستقیم پر گامزن ہونے سے قاصر رہ گئے۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس کی بنا پر انسان روحانی اقدار سے ناواقف ہو کر مادہ پرست بن گیا۔ روحانی اقدار سے دوری نے جب انسان کو بے راہ کر دیا تو ان دیکھی ہستی نے اس روحانی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے اور اسے جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے اپنے نمائندے دنیا میں بھیجے تاکہ وہ انسانوں کو خبردار کر کے انہیں گہرے اور عمیق گڑھوں میں گرنے سے بچنے کی تلقین کریں۔

پیغمبروں کی تعلیمات جب تحریف کے خوشنما پردوں میں چھپ گئیں تو اُس ان دیکھی ہستی نے ایک اور اپنا نمائندہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا۔ اس آخری نمائندے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا۔ کہ

"پرسکون زندگی یقین کے راستے پر رواں دواں ہے"۔

اور اس راستے پر چلنے کے لئے اس نمائندے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آدم ذاد برادری کو زندگی گزارنے کے لیے اصول بتائے۔ اس میں ایک اصول یا رکن "حج" ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر لی تو انہوں نے اللہ تعالی سے عرض کیا۔ تعمیر تو میں نے مکمل کر لی ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا۔۔۔ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ پروردگار عالم میری آواز کہاں تک پہنچے گی؟ اللہ تعالی نے فرمایا "تم اعلان کر دو، پہنچانا میرا کام ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ کن الفاظ میں دعوت دوں؟ اللہ تعالی نے فرمایا۔ "کہو۔۔ لوگو تم پر قدیم گھر کا حج کرنا فرض کر دیا گیا ہے، تو آسمانوں اور زمین والوں نے سن لیا۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ وہ دور دور کے شہروں سے لبیک کہتے ہوئے کس طرح آتے ہیں۔"

ان دیکھی مقتدر ہستی چاہتی ہے کہ نوع انسانی برادرانہ طرزوں میں یقین کے راستے پر سفر کرے۔ وہ ہستی نہیں چاہتی کہ برادری سسٹم سے الگ ہو کر کوئی فرد اپنے لئے کوئی الگ راستہ متعین کرے۔

پاکیزہ کردار نمائندے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اعلان کیا کہ۔ ان دیکھی مقتدر ہستی چاہتی ہے کہ یقین کی قوت کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جاؤ اور آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور محبت کے راستوں میں کسی بھی طرح دراڑیں نہ ڈالو۔

حج اللہ تعالی کی اس آواز، اللہ تعالی کی اس خواہش، اور اللہ کی اس طرز فکر کا آئینہ دار ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں مالی، بدنی، ذہنی اور روحانی ہر اعتبار سے انسان کی صلاحیتیں کام کرتی ہیں۔ مالی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اس میں مال خرچ ہوتا ہے۔ مشقت اور تکلیف بھی اس عمل میں دوسرے اعمال کی نسبت زیادہ ہے۔ اس عمل کو جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے، یہ اعلیٰ ترین مشکل ترین اور سراسر یقین کی دنیا ہے۔ اور اللہ تعالی کی اس آواز کا مظاہرہ ہے۔

"تم اعلان کر دو پہنچانا میرے ذمے ہے"

یقین کی دنیا میں بسنے والے لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ ہر حاجی کی روح میں اللہ تعالی کی آواز ایکو (ECHO) ہو رہی ہے۔

اور اللہ تعالی کی دوسری آواز۔

"اکٹھے ہو کر میری رسی کو مضبوط پکڑ لو اور آپس میں بکھر نہ جاؤ"۔

خدوخال کا روپ دھار کر جب اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو ایک آواز پر کم و بیش بائیس لاکھ افراد ایک ساتھ اجتماعی طور پر لبیک کہتے ہوئے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور عملاً اس یقین کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالی کی آواز۔

"کہو۔۔۔ لوگو۔۔۔ تم پر پر قدیم گھر کا حج کرنا فرض کر دیا گیا ہے۔ تو آسمانوں اور زمین والوں نے سن لیا۔

کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ وہ دور دور کے شہروں سے لبیک کہتے ہوئے کس طرح آتے ہیں۔" انہوں نے آواز سنی ہوئی ہے۔

ہم تین دوستوں میں اتنی پرانی دوستی ہے کہ اس دوستی کو ماہ و سال کا زمانہ محیط نہیں ہوتا۔ زمانہء قدیم میں ابھی یہ کائنات بنی بھی نہ تھی اور گلستانِ کائنات کے شگوفے گھونگھٹ اوڑھے محوِ خواب تھے، ہم تین دوست احساس کی دنیا سے اس پار موجود تھے......احوال و شعور کیا ہے......؟ ظاہری اور باطنی حسیات و کیفیات کسے کہتے ہیں......؟؟ ہم تینوں کو اس کا کوئی علم نہیں تھا...... یکایک ہمارے کانوں میں ایک آواز گونجی۔ جب ہم اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو ایک میکانیکی عمل ہمارے سارے وجود میں سرایت کر گیا اور ہم نے پہلی بار محسوس کیا کہ سننے کے عمل کے ساتھ ہم دیکھ بھی سکتے ہیں...... دیکھنے کی حِس نے ہمیں دکھایا کہ ہم خود اپنے اندر ایک پوری کائنات ہیں اور یہ ساری کائنات ایک ایسی رواں دواں کشتی ہے، جس پر اربوں کھربوں افراد سوار ہیں...... کنارے لگی کشتی جب ہچکولے کھاتی ہے تو کشتی میں افراد سوار ہو جاتے ہیں۔ اور کشتی میں سے جب کوئی فرد اُتر جاتا ہے تو وہ کبھی کشتی میں سوار نہیں ہوتا...... کشتی اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے......افراد سوار ہوتے اور اترتے رہتے ہیں۔ کشتی میں سے جو اُتر جاتا ہے، پتہ نہیں، اسے آسمان کھا جاتا ہے یا زمین نگل جاتی ہے۔

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم تینوں دوست توام ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں نہ ایک دوسرے کے بغیر رہ سکتے ہیں...... ہم نے دیکھا کہ کشتی چل رہی ہے۔ مسافر سوار ہو رہے ہیں۔ جو مسافر کشتی سے اُتر جاتا ہے، اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا...... سوار ہونے والا آدمی کہاں سے آتا ہے اور کشتی میں سے اُتر کر کہاں گم ہو جاتا ہے، اس کا سراغ لگانے کے لئے ہم تینوں میں سے ایک پستہ قد نے کہا کہ وجود ہی سب کچھ ہے......وجود کیا ہے......؟ کہاں سے آیا ہے......؟؟ کیوں ہے...........؟؟؟ یہ سب میں نہیں جانتا...... لیکن یہ بات سامنے کی ہے کہ جب وجود کے معروضی خدّوخال آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو ایک مست و بے خود کر دینے والی کیفیت سے نکل کر عذاب ناک کیفیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے......اس عذاب ناک اس زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے مجھے دوسری مست و بے خود کر دینے والی اشیاء کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ نشہ، سختی اور عقل و ضمیر کی تنقید سے بیزاری کی جگہ وسیع شعور کو بیدار کر دیتا ہے...... نشہ، خیال و دبستان کو متحد کر کے ''نہیں'' کی بجائے ہر بات کو ''ہاں'' میں بدل دیتا ہے۔ کیفیات کے شدید یخ بستہ احساسات میں ٹھٹھرا ہوا انسان بے درد پتش سے دل و دماغ کو گرما لیتا ہے...... گرمی کی اس یخ اور ٹھنڈی بھٹی میں سے گزر کر سوچ کے اوپر پڑے ہوئے دبیز اور گہرے پردے اُٹھ جاتے ہیں......دماغ میں پھلجڑیاں روشن ہو جاتی ہیں۔

دوسرے دوست نے پہلے دوست کی بات کو دھیان سے سنا اور کہا......

''اعمال کی بھٹی سب کو دھارن کرنی پڑتی ہے۔ نشہ اگر مست و بے خود کرتا ہے تو شعور مطلق سے دور بھی کر دیتا ہے...........''

تجربہ یہ ہے کہ میری ہر کوشش پر ناکامی اور کامیابی کی مہر ثبت ہے۔ ناکامی، زندگی کو حرفِ غلط کی طرح ہر وقت مٹا دینے پر مامور ہے۔ ناکامی، زندگی کے خون آلود جگر ٹکڑوں کے علاوہ کسی چیز پر اکتفا نہیں کرتی۔ قدم قدم پر تذلیل نفس کا احساس اژدہا بن کر ہمارے مقابل ہے۔ ناکامیوں کے تجربے کوششوں کا محور ہیں۔ انسان کتنا ہی کامیاب ہو جائے نتیجے میں انسانی تقدیر یہ ہے کہ موت، یعنی ناکامی انسان کا مقدر ہے۔

تیسرا دوست یوں بولا............

یارو............ میری بات غور سے سنو، ہم نے جب پہلی آواز سنی تھی، اُس گھن گرج آواز میں ترنم آمیز ہلکی موسیقی تھی اور اس آواز کی طرف جب آنکھ اُٹھی تو وہاں ہم نے ایک ملکوتی تبسّم چہرہ دیکھا تھا۔ گلاب کی سی پنکھڑیوں جیسے لب ہلے تھے اور یوں محسوس ہوا تھا جیسے گلگوں چہرے پر مخمور آنکھیں ہمیں پیغام دے رہی ہیں کہ دوری تذلیل نفس کا احساس ہے اور قربت کامیابی اور کامرانی ہے...... دوستو...... یاد کرو...... ہم نے آواز کے اوپر لبیک کہتے ہوئے دوری سے انحراف اور قربت کا اقرار کیا تھا...... ناکامی یہ ہے کہ ہمیں کامیابی کی صحیح تعریف ہی معلوم نہیں۔ انسانی تقدیر پر موت کا غلبہ ہی کامیابی ہے...... کشتی میں سوار جب کوئی شخص اُتر کر گم ہو جاتا ہے، وہ دراصل گم نہیں ہوتا، وہ کامیابی کے نئے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ تپتی ریت اور جھلسا دینے والی ہواؤں سے گزر کر وہ ایک ایسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں متبسم ملکوتی چہرہ ہمارا منتظر ہے۔

جب ہم حیوانات اور جنات کا انسانوں سے موازنہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حیوانات اور دوسری مخلوقات میں انسانوں کی طرح تمام تقاضے موجود ہیں۔ فرشتوں کے تذکرے میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ فرشتے بھی علم رکھتے ہیں اور کائنات میں اللہ کی حاکمیت کے تصور کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

انسان۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سے ملتا جلتا پیکر ہے۔ جس طرح انسان جسم رکھتا ہے۔ حیوان بھی جسم رکھتے ہیں۔ حیوانات میں نسل کشی ہے تو انسانوں میں بھی تولید کا سلسلہ جاری ہے۔ نباتات میں نشوونما ہوتی ہے تو انسان بھی لامتناہی نشوونما کے دبیز پردوں میں ارتقاء کر رہا ہے۔ حیوانات کے اندر جبلت کام کرتی ہے تو جبلت کے بغیر انسانی زندگی بھی بیکار ہے۔ بھوک پیاس حیوانات کے لیے اگر مجبوری ہے تو انسان بھی مجبوری کی اس کال کوٹھری میں بند ہے۔ جنسی کشش انسان کے اندر موجود ہے۔ حیوانات میں صنفی میلانات ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ انسان اگر ذی روح ہے تو حیوانات، نباتات اور جمادات بھی روح کے دائرے سے باہر نہیں ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان اور حیوانات، نباتات اور جنات کے بھی وہی جذبات اور احساسات ہیں جن کے اوپر انسانی زندگی رواں دواں ہے تو پھر انسان کا شرف کیا ہے۔ انسان کا شرف یہ ہے کہ اللہ رب الرحیم نے انسان کو اپنی امانت سونپی ہے۔ یہ وہ امانت ہے جس کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے یہ کہہ کر قبول نہیں کیا تھا کہ ہم اس بار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم نے آپ کی عطا کردہ امانت کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیا تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ یہی وہ امانت ہے جس کو اللہ نے علم الاسماء کہا ہے۔ اللہ کی صفات کا ایسا علم جو جنات اور فرشتوں کو بھی حاصل نہیں ہے۔

کائنات میں انسان وہ واحد برادری ہے جو اللہ کے ان علوم کی امین ہے۔ اللہ نے یہ علوم نوع انسانی کے باپ آدمؑ کے علاوہ کسی کو نہیں سکھائے۔

"لوگو بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں۔ ان سب کا خالق ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین بچھونا اور آسمان کو چھت بنادیا ہے۔ اور آسمان سے پانی اتارا۔ اور اس کے ذریعے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔" (سورۃ البقرۃ، ۲۲-۲۱)۔

"اللہ وہی ہے جس نے زمین و آسمانوں کو بنایا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے ثمرات نکالے، جس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ جس نے سورج چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کیا۔ (سورۃ ابراہیم: ۳۳-۳۲)

اللہ رب الرحیم یہ بھی کہتا ہے کہ یہ ساری کائنات اور جملہ وسائل انسان کے فائدے کے لیے بنائے ہیں مگر اسے ان کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ وہ ان وسائل کا مالک نہیں بلکہ امین ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ کی زمین مخلوق کے لیے بچھونا بنی ہوئی ہے اور بندہ اس زمین سے ہر طرح کی آسائش حاصل کرتا ہے۔ لیکن اللہ اپنی ملکیت اس زمین کا ایک پیسہ بھی طلب نہیں کرتا۔ جب کہ انسان زمین کے ایک ایک فٹ کی قیمت لگا کر اپنی

ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے۔اللہ نے اپنی ملکیت زمین کے اندر پانی کی نہریں جاری کر دی ہیں۔ جس کی کوئی قیمت اللہ نے متعین نہیں کی۔اور انسان پانی کو نہ صرف فروخت کرتا ہے بلکہ پانی کی تقسیم پر لڑتا ہے اور ایک دوسرے کے درپے آزار رہتا ہے۔

خدا نے آدم زاد کو ایک شکل وصورت پر پیدا کر کے ایک برادری بنایا مگر آدم زاد نے طرح طرح کے بھیس بدل کر نئے نئے نام رکھ لیے۔اللہ نے آدم زاد کو ایک باپ آدم اور ایک ماں حوّا سے تخلیق کیا تا کہ انسان برادری اور باہمی رشتوں میں منسلک رہ کر اخوت و محبت، بھائی چارہ اور یک جہتی کا پرچار کرے۔ ہائے افسوس رشتہ انسانی کی وحدت بے شمار ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ایک نسل بہت سی نسلوں میں تبدیل ہوتی رہی۔اور نسل کے نام پر آپس میں تفرقے کا لا متناہی سلسلہ چل پڑا۔ وطن بہت سارے بن گئے۔ قوم نے بیشمار قوموں کا روپ دھار لیا۔بیشمار قومیں وجود میں آئیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔زبان نسلی منافرت کا ذریعہ بن گئی اور لباس کے پُرفسوں دھاگوں میں انسانیت پارہ پارہ ہو گئی۔ مفت حاصل شدہ زمین وجہ اختلاف بن گئی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ جب ایک گھر کے افراد ایک ساتھ اخوت کے رشتے میں منسلک رہ سکتے ہیں تو ملک و قوم اخوت کے رشتے کیوں قائم نہیں کرتے۔اس سوال کے جواب میں قرآنی تعلیمات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں۔

صرف ایک حقیقی رشتہ ہے اور وہ خدا پرستی کا رشتہ ہے۔ ہم کتنے ہی الگ ہو جائیں لیکن ہمارا خدا ایک ہے۔ ہم کسی بھی طرح نعوذ باللہ خدا کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم سب ایک پروردگار کے بندے ہیں۔ ہم سب کی جبینِ نیاز کے لیے ہی اللہ رب الرحیم کی چوکھٹ ہے۔ کوئی نسل ہو۔ کوئی وطن ہو۔ کوئی قومیت کسی بھی درجے کی ہو۔ آسمانی رشتے سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔

برائی اور گناہ انسان کی سرشت میں داخل ہیں۔ لیکن انسان کا ضمیر اللہ کے نور کا مسکن ہے۔ ضمیر ایک نور باطن ہے۔ جس سے انسان کے اندر نیکی کی مشعلیں روشن ہوتی ہیں۔ ہم آپس میں سب بہن بھائی ایک باپ کی اولاد ہیں۔اور ایک باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت میں کوئی وجہ افتخار ہے تو وہ نیکی اور آپس میں محبت واخوت ہے۔ خود ساختہ امتیازات چالاک اور عیار لوگوں نے اپنی خدائی چلانے کے لیے قائم کئے ہوئے ہیں۔اللہ رب الرحیم کے خود اپنے ارشاد کے مطابق جب زمین کا مالک ایک ہے، آسمانوں کا مالک ایک ہے اور اس نے آدم زاد برادری کو ایک ہی ماں باپ سے پیدا کیا ہے تو نوع انسانی کا دین بھی ایک ہونا چاہیئے۔ کنبہ اور برادری بھی ایک ہونا چاہیئے۔

"اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا۔اور جس کو اللہ نے رسول اللہؐ پر وحی کیا ہے۔اور جس کا اللہ نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ کو بھی حکم دیا تھا۔اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔"

روایت ہے کہ دین کی اساس قائم رکھنے کے لیے اللہ رب الرحیم نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغامبر دنیا میں بھیجے اور تمام پیغمبر اسی بات کی تلقین کرتے رہے کہ

اے انسان تو اللہ کی ملکیت ہے۔ جس زمین پر تو چلتا پھرتا ہے اور جس زمین میں سے کھیتیاں اُگتی ہیں اور جس زمین پر تیرے لیے چشمے اُبلتے ہیں وہ بھی اللہ کی ملکیت ہے۔ جس سورج کی تپش اور دھوپ کھیتیاں پکا کر تیرے لیے غذا بناتی ہے۔ وہ بھی اللہ کی ملکیت ہے۔ اور جس چاند کی رو کی پہلی چاندنی کھیتوں اور پھلوں میں رس گھولتی ہے وہ بھی اللہ کی ملکیت ہے۔

تیرے باپ آدمؑ کو اللہ نے بنایا۔ اور تیرے باپ آدمؑ سے تیری ماں حوّاؑ کو تخلیق کیا۔ ایک باپ اور ایک ماں سے تیری نسل چلائی۔ جب نسل پھیل گئی تو بہن بھائیوں کے رشتے کو توڑ کر الگ الگ برادریوں میں بٹ گئے۔ آپس میں تفرقے نے جنم لے لیا اور ایک گھر کی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ظلم اور جہالت نے تمہارے چہروں پر کالک مل دی اور تم جھوٹی انا کے خول میں بند ہو کر اپنے بھائی کے دشمن بن گئے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ آج کا ہر باپ موت کا لقمہ ءتر بن رہا ہے۔ اور باپ کا ہر بیٹا باپ بن رہا ہے۔ ہم سے قرآن کریم سوال کرتا ہے۔

"کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں۔ اور سب کو اُسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔"

میرے بھائیو۔ میرے سجنو اور میرے بزرگو!

دین میں سربلندی اور آخرت میں نجات کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ہم ایک اللہ کی ملکیت میں رہتے ہوئے ایک اللہ کی حاکمیت کو قبول کریں۔ اور اللہ کے بنائے ہوئے ایک باپ کی اولاد کی حیثیت سے آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں۔

اللہ رب الرحیم کا حکم ہے۔

"اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو۔ آور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔" (سورۃ آلِ عمران: ۱۰۳)

## بچپن کی تصویر

جب ہم آدمی اور انسان کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آدمی میں اور زمین پر پھیلی ہوئی دوسری مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیات و ممات کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ سب کے اندر زندگی کے مراحل یکساں ہیں۔ سب پیدا ہوتے ہیں اور سب مر جاتے ہیں۔ ہر مخلوق میں حواس ہیں۔ مخلوق کے ہر فرد میں تقاضے کام کرتے ہیں۔۔

پیار کا تقاضا، نفرت کا تقاضا اور نسل کشی کا تقاضا، بھوک پیاس کے تقاضے، غمگیں اور خوش ہونے کے تقاضے۔۔۔ اگر تقاضوں کا نام آدمی ہے تو ہاتھی اور زمین پر رینگنے والا ہر کیڑا تقاضوں سے مرکب ہے۔ جس طرح انسان زندگی اور موت میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی بقاء کے لئے نسل در نسل اولاد پیدا ہو رہی ہے اسی طرح گائے، بھینس، بیل، اونٹ، پرندے، بیکٹریا، وائرس بھی اولاد در اولاد قائم ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کی فضیلت اس بات میں ہے اس کے بچے ہوتے ہیں۔۔۔ آدمی کی فضیلت اس بات میں ہے کہ اسے بھوک لگتی ہے۔۔۔ آدمی بیمار ہوتا ہے۔۔۔ صحت مند بیمار ہو جاتا ہے۔۔۔ گھر بناتا ہے۔۔۔ آدمی کے اندر عقل ہے اور دوسرے حیوانات میں عقل نہیں ہے۔

جس طرح مخمور آنکھ ہرن، ماں یا باپ ہے اسی طرح پیلا، سفید م کالا اور سرخ رنگ آدمی بھی ماں باپ ہے۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے آدم کا تعارف دو طرح سے کرایا ہے۔۔۔ آدمی۔۔ اور انسان۔۔۔ آدم کا تذکرہ ہوتا ہے تو ایک پھٹکی سے بنا ہوا آدمی بدبودار اور ناپاک سیال ہمیں نظر آتا ہے۔۔۔ لیکن جب انسان کا تذکرہ ہوتا ہے۔۔ تو انسان کائنات میں ہر مخلوق سے ممتاز ہے۔ آدم کی فضیلت ہی یہ ہے کہ آدم، آدمی کے درجے سے بہت اعلیٰ و ارفع، احسن تقویم "انسان" ہے۔

اگر آدم انسان نہیں ہے تو بھیڑ، بکری سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

کوئی بھی فرد اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہر شخص پیدا ہوتا ہے۔۔۔ پیدائش ہی اس کا تعارف ہے۔۔۔ دوسرا تعارف اس کا نام ہے۔۔ اور یہ نام وہ خود نہیں رکھتا۔۔۔ پہلے سے موجود کوئی انسان رکھتا ہے۔۔۔ بڑی عجیب اور پر اسرار بات یہ ہے کہ انسان گھٹتے بڑھتے جوان ہوتا ہے اور گھٹتے بڑھتے بوڑھا ہوتا ہے۔۔۔ ایک دن کا بچہ ستر ۷۰ اسی ۸۰ سال کا ہو جاتا ہے اور اپنا کردار پورا کر کے پردہ اسکرین سے اتر جاتا ہے۔۔۔ انسان غائب ہو جاتا ہے اور کسی کی دی ہوئی شناخت: نام "صدیوں تک قائم رہتی ہے۔

میں عاجز و مسکین بندہ اپنے مرشد قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا "داس" ہوں کہ یہی میری شناخت ہے۔

میری ماں جس کی گود جنت اور جس کی ماں تا اللہ کا پیار ہے۔ جس نے اپنا لہو پلا کر مجھے جنم دیا اور جس کے خون کے قطرے میرے بدن میں ناک، کان، آنکھ بن گئے ہیں۔۔۔۔۔

ماں نے بچپن کی ایک تصویر مجھے دکھائی۔۔۔۔ پوچھا یہ کون ہے۔۔۔۔۔۔۔۔؟ میں نے کہا یہ ایک خوبصورت بچہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو سب کو نظر آ رہا ہے، یہ بچہ کا فوٹو ہے، ماں نے کہا۔۔۔۔۔ یہ بتادے کہ یہ تصویر کس کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔؟

میں نے کہا۔۔۔۔اماں تُو ہی بتادے کہ تصویر کس کی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔میری ماں کے سراپا میں بجلیاں دوڑ گئیں۔۔۔۔۔۔آنکھیں لال انگارہ نظر آئیں۔۔۔۔۔۔۔چہرہ پر ممتا کی شفق پھیل گئی۔۔۔۔۔۔۔تصویر کو گلاب کی پنکھڑی لبوں سے چوما۔۔۔۔۔۔۔ماں کی زبان سے صدائے کن فیکون کی بازگشت سنائی دی۔۔۔۔۔

میرے بچے یہ تصویر تیری تصویر ہے۔

نومبر 1999ء میں مرکزی مراقبہ ہال کے نگران صاحبان کا پریکٹیکل تربیتی پروگرام ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔حبس اور آکسیجن کی کمی سے خون کی ترسیل رک گئی۔ قلب ڈوبنے لگا۔۔۔۔۔بلڈ پریشر اوپر ہوگیا۔ موت کو اپنے ارد گرد رقصاں کرتے دیکھا۔ عظیمی ڈاکٹروں کا پینل بیٹھ گیا۔ جان سے زیادہ عزیز پیارے شاگردوں کی سکتہ کی سی کیفیت ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔مراقبہ ہال کی فضا میں اداسی گھل گئی۔ درختوں کے پتے ساکن ہوگئے، پھول مرجھائے ہوئے محسوس ہوئے۔۔۔۔۔آنکھیں برستے بادل بن گئیں۔ دست دعا دراز ہوئے۔۔۔۔۔اللہ نے اپنے پیاروں کی التجا سنی۔ دریائے رحمت جوش میں آیا۔۔۔۔۔۔گرج چمک ہوئی۔۔۔۔۔۔بارش پڑی، دلوں کو قرار آگیا۔۔۔۔۔۔اور ماں جایہ۔۔۔۔۔۔قیامت سے گزر کر واپس آگیا۔۔۔۔۔۔

سوال یہ ہے!

اگر یہ سب نہ ہوتا تو میاں خواجہ شمس الدین عظیمی ۔۔۔۔۔۔۔کہاں ہوتے۔۔۔۔۔۔۔۔؟ نام کہاں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔جسم کہاں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔؟

جب تک آدم آدم رہتا ہے، کشش ثقل میں محدود رہتا ہے اور جب آدمی انسان بن جاتا ہے تو اس کے اوپر سے محدودیت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ زمین کے باہر بھی سفر کرتا ہے، زمین کے اندر بھی دیکھتا ہے۔ اور کتے بلی سے ممتاز بھی ہو جاتا ہے۔

میری ماں نے میری تصویر دکھا کر مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ تصویر کس کی ہے۔

میں اپنے بچوں اور روحانی ڈائجسٹ کے قارئین سے پوچھتا ہوں۔۔۔۔۔۔کہ آپ جس عمر کے بھی ہیں۔۔۔۔۔۔بتائیں کہ جب آپ کی ہر چیز تبدیل ہوگئی ہے تو نام کیوں تبدیل نہیں ہوا۔۔۔۔؟ کیا آپ اپنے معصوم دور بچپن کی تصویر پہچان سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟

خواتین و حضرات اس نکتے پر غور و فکر کریں۔ آپس میں ایک دوسرے سے DISCUSSION کریں۔ میرے بچو۔۔۔۔۔۔۔۔میرے شاگردو۔۔۔۔۔۔میرے دوستو۔۔۔۔۔۔۔یہ بات بظاہر آپ کو بہت چھوٹی محسوس ہوگی۔۔۔۔۔۔لیکن یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ جب آپ غور کریں گے اور ماضی میں اتر جائیں گے تو آپ کے اوپر بے شمار حقائق منکشف ہوں گے۔ زہن کے دریچے کھل جائیں گے۔

ہر وہ بندہ جو اس دنیا میں موجود ہے کسی نہ کسی رشتہ کی بنیاد پر جوان، بالغ، باشعور اور تجربہ کار ہوتا ہے۔ رشتوں کی کڑی در کڑی ایک زنجیر ہے لیکن یہ زنجیر جس حلقہ میں، حلقہ در حلقہ طویل ہو رہی ہے وہ پہلے ناسوتی مرحلہ میں ماں باپ ہیں۔ محبت اور تعلق کے شعور کا پہلا درجہ تصوراتی کیفیت ہے۔۔۔۔۔انسان زندگی کے مراحل جن تصورات پر پورے کرتا ہے۔۔۔۔۔وہ یا تو دیکھ چکا ہے یا وہ چیزیں دیکھ رہا ہے اس کا پورا پورا عکس اس کے دماغ میں نقش اور حافظہ میں محفوظ ہے اور جو چیزیں اس کے سامنے ابھی نہیں آئیں ان کا تصور دیکھی ہوئی چیزوں سے قائم کرتا ہے۔۔۔۔

ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کو چاہے اور اسے کوئی چاہے۔ یہ بات بھی اس کی فطرت ہے کہ وہ خود کو کسی کے سپرد کر دینا چاہتا ہے اس خود سپردگی سے اسے تقویت ملتی ہے اور مستقبل کی تاریکی روشنی میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان تین ادوار ماضی ، حال اور مستقبل میں سانس لیتا ہے زندگی کا ہر وقفہ اور حیات و ممات کا ہر سانس اس کے انر (INNER) میں بجتا ہوا ایک ریکارڈ ہے۔

ریکارڈ کا بجنا ہی اسکی زندگی ہے، ریکارڈ نہیں تو آدمی مر جاتا ہے۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

ریکارڈ کی پہلی آواز اور آواز کا پہلا سر، سر کی پہلی تان اور تان کی پہلی تھاپ اور تھاپ کا پہلا ارتعاش محبت ہے محبت کیا ہے۔

محبت کائنات کی پہلی حرکت ہے۔

میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے محبت کے ساتھ خلائق کو تخلیق کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں (حدیث قدسی)

مادی محدود کائنات میں ماں کی مامتا، باپ کی شفقت، کلی پھول اور کونپل کو محبت سے آشنا کرتی ہے، ماں کی مامتا اور باپ کی عظمت جسمانی رشتوں کو برقرار رکھتی ہے۔

آدم زاد جب محبت کی آخری سیڑھی پر ہوتا ہے تو اسے یہ آخری سیڑھی معلق نظر آتی ہے۔

صورتحال یہ ہے کہ کوئی فرد بشر پہلی سیڑھی کو پہلی سیڑھی نہیں کہہ سکتا۔

اسلئے کہ:

ماں کو اگر پہلی سیڑھی مان لیا جائے تو آدم زاد کو اس کا ادراک بتاتا ہے کہ ماں کیلئے بھی پہلی سیڑھی اسکی ماں کی محبت تھی۔۔۔۔۔

محبت تھی۔۔۔۔۔لفظ اس کے اندر تجسس پیدا کرتا ہے کہ میری ماں، میری ماں اور میری ماں کی ماں بھی ہو گزری ہے۔۔۔۔اربوں کھربوں اُن کے نقوش تصورات اماں حوا تک جا پہونچتے ہیں۔ اماں حوا پر ایک آن کیلئے ذہن رکتا ہے تو نظر آتا ہے کہ مواخذہ کا وجود آدم کے وجود کا رن مثبت ہے۔۔۔۔۔۔۔!

آدم کا وجود کیسے بنا۔آدم کہاں سے آیا۔۔۔

جس منبع سے آدم کا پیکری وجود زمین پر اترا تھا وہ اگر جنت فردوس ہے تو جنت الفردوس کا خالق کون ہے؟۔۔۔۔۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں ہم نقطۂ آغاز سے متعارف ہوتے ہیں۔

ہر انسان اختیاری اور غیر اختیاری طور پر اس کا متلاشی رہتا ہے کہ نقطۂ آغاز سے اس کا تعلق قائم ہو جائے اور۔۔۔۔۔۔اس تعلق کو وہ گوشت پوست کے جسم سے ظاہر کرے۔۔۔۔۔

ارتقائی ادوار سے تجربات کے بعد یہ اسلوب معین ہوا کہ خالق سے مخلوق کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کیلئے۔۔۔۔

بتایا گیا

خالق اپنی مخلوق سے ستّر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

مذہب نے اس زاویۂ نظر کو بہت زیادہ وقعت دی اور خالق کی صفات پر تفکر سے خالق اور مخلوق کے درمیان رشتوں کی نشاندہی کی۔

عبدالودود۔۔۔۔۔ودود کا بندہ۔ودود کے معنی پیارے اور محبوب کے ہیں۔ہر ماں کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے۔

عبدالقدوس۔۔۔۔۔۔بزرگ تر ذات کا بندہ۔۔۔۔بچہ کیلئے ماں سے زیادہ کوئی ذات بزرگ تر نہیں ہوتی۔۔۔۔عبدالولی۔۔۔۔۔۔ولی کے معنی ہیں، دوست۔۔۔۔اولاد کیلئے ماں سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہوتا اور ماں کیلئے اولاد سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

عبدالحنان۔حنان کا بندہ۔۔۔۔حنان اس محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اولاد سے ہوتی ہے۔

عبدالخالق۔۔۔۔۔پیدا کرنے والے کا بندہ، بلاشبہ اللہ کے علاوہ کوئی خالق کے مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔لیکن خود اللہ نے ماں کو تخلیق کا ذریعہ اور واسطہ بنا دیا ہے۔

اللہ کیسی کیسی تصویریں ماں کے رحم میں بناتا ہے۔(القرآن)

عبدالرحیم۔۔۔بہت رحم کرنے والے کا بندہ۔۔۔۔۔بچہ کے اوپر اگر ماں کی محبت محیط نہ ہو تو پرورش کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔۔۔۔۔

من موہن دلوں کا محبوت اللہ ! اپنے بندوں کے ساتھ جسطرح اظہار محبت کرتا ہے وہ بجائے خود بندوں سے تعلق اور رشتہ قائم ہونے کی روشن دلیل ہے۔

اے پیغمبرؐ

میرے ان بندوں کو پیغام پہنچا دیجئے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اللہ یقنیاً تمھاری خطاؤں کو بخش دے گا۔ بے شک وہ غفور و رحیم ہے (الزمر د ۵۳)

جلد ۵ صفحہ ۱۴۴ پر مسند احمد جنبل میں لکھا ہوا ہے۔

حضرت ایوب انصاری نے اپنی وفات کے وقت لوگوں سے کہا:

سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا ہے اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو اللہ رب العالمین کوئی اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اسکو بخشتا۔

ایک صحابی کو شراب خوری کے جرم میں بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لایا گیا۔ تو صحابہ میں سے کسی نے انہیں لعنت کی۔۔۔۔

رحمت اللعالمین کو یہ بات پسند نہیں آئی۔۔۔ فرمایا:

اس پر لعنت نہ کرو۔ کیونکہ اسے خدا اور اس کے رسول سے محبت ہے۔

اے آدم کے فرزند۔۔۔

تم مجھے پکارتے رہو اور مجھ سے آس لگائے رکھو میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں۔ اے آدم کے بیٹو۔۔ اگر تمھارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں تمہیں معاف کر دونگا۔ خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں۔

اے آدم کی نسل

اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھر جائے۔۔۔ پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ میرا شریک نہ بناؤ میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے آؤں گا۔۔۔

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔ (سورہ انعام ۵۴)

ہاں ! خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگیں ہوں گے (سورہ یونس ٦٢)

میدان جنگ میں ایک عورت اپنے گمشدہ بچے کو دیوانگی کے عالم میں تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ سامنے جو بچہ اسے نظر آتا وہ گور میں لیکر جوش محبت میں اپنے سینہ سے لگا کر دودھ پلانے لگتی۔

سیدنا حضو علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس عورت کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔

کیا ممکن ہے کہ یہ عورت اپنے بچہ کو خود اپنے ہاتھوں دہکتی آگ میں ڈالدے

صحابہ نے عرض کیا۔۔ یارسول اللہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جتنی محبت اس ماں کو اپنے بچے سے ہے خدا اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔

وہ جس کو چاہتا ہے دانائی دے دیتا ہے، اور جسے دانائی ملی تو بے شک اسے بڑی خوبی ملی، اور وہی نصیحت قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔(البقرہ۲۶۹)

کائنات کے متعلق جدید تصور یہ ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ جوں جوں کہکشاؤں کے جھرمٹوں کے درمیان خلا پھیلتا جارہا ہے وہ کہکشائیں (GALAXIES) ایک دوسرے سے جدا ہو رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہت زمانے پہلے کہکشائیں ایک دوسرے کے قریب تھیں اور بیس ارب سال پہلے کائنات ایک نقطے پر مرتکز تھی۔ پھر ایسا عظیم دھماکہ ہوا کہ یہ نقطہ مرتکزہ پھٹ پڑا اور کائنات کے خدوخال ظاہر ہو گئے۔ موجودہ سائنس کہتی ہے کہ کائنات کا مادہ کثیف حالت میں گندھا ہوا تھا اور اس کا درجہ حرارت کروڑوں ڈگری پر تھا اس کثیف دہکتی ہوئی اور گرم کائنات میں یکایک چکا چوند روشنی ہوئی اور یہ روشنی کائنات کے افراد بن گئی۔

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''خدا نے ابتدا میں زمین وآسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور اس کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے کہا، روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا، تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی۔'' پیدائش باب ۱: (۱-۵)

اللہ کی آخری کتاب ہمیں بتاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو وہ چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی ہو، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکتا ہو چاہے نور کی طرف جس کی چاہے راہ نمائی فرماتا ہے۔ (سورۃ النور: ۳۵)

ان دونوں آیتوں پر تفکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ فلکیات اور مذہب کی تشریح میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ مذہبی کتابوں میں یہ بھی ہے کہ اللہ ان لوگوں پر کائنات کے فارمولے منکشف کر دیتا ہے جو کائنات میں تفکر کرتے ہیں۔

تفکر کی بات سامنے آئی تو یہ سوال از خود سامنے آجاتا ہے کہ جب یہ کائنات پھیل رہی ہے اور کہکشاؤں کے درمیان خلا بھی پھیلتا جا رہا ہے تو سائنسداں یہ بھی تو بتائیں کہ آغاز سے پہلے کیا تھا۔ آغاز کرنے والا کون تھا۔ کائنات کی اتنی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مشینری کو چلانے والا کون ہے؟

کائناتی وجود کا تذکرہ آتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ کائنات ہر لمحہ حرکت میں ہے کائنات بہت سے وجود مل کر قائم ہے اور ہر وجود ایک قاعدے اور ضابطے کے ساتھ سرگرم عمل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے بطن سے انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ شیرنی کے پیٹ سے شیر کا بچہ جنم لیتا ہے۔ اگر آغاز سے پہلے کوئی طاقت نہ ہوتی تو یہ مربوط نظام کیسے قائم رہتا۔ شیر کے یہاں انسان اور انسان کے یہاں شیر پیدا ہوتے۔

سائنس دان یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز اندر سے عقل ثابت نہ کرے وہ قابل قبول کس طرح ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم جب عقل میں تفکر کرتے ہیں تو یہ کہے بغیر گزارہ نہیں ہے کہ ہمارے اندر عقل بھی ہماری نہیں ہے۔ اگر عقل پر ہماری گرفت ہے تو پیدائش کے بعد سے شعور بالغ ہونے کے بعد تک ہم کیوں عقلی اعتبار سے کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں۔ کائنات کا مربوط نظام ہی ہمیں بے عقلی سے عقل کی طرف لے جاتا ہے اور اس سفر میں اعتدال اور توازن نہ ہو تو عقل ذہنی عذاب بن جاتی ہے۔

ایسا نظر آرہا ہے کہ آج کا سائنس دان ایک دن یہ راز ضرور معلوم کرلے گا کائنات کے آغاز سے پہلے کیا تھا۔ کائنات کے اعضا (کہکشانی نظام بے شمار زمینیں اور زمینوں کے اوپر بے شمار نوعیں اور نوعوں کے انسانی شماریات سے زیادہ افراد) کی پلاننگ اور ڈرائینگ کس نے کی ہے یا اس لئے ہوگا اور۔۔۔۔۔۔۔ یقیناً ہوگا کہ۔

مذہبی دانشور یہ سوچ کر ٹھہر گیا ہے کہ خدا نے کہا۔ ''روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔'' خدا نے کہا۔ ''اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔'' اس سے آگے اس نے کبھی سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

لیکن سائنسدان سوچتا ہے۔ تفکر کرتا ہے۔ گہرائی میں ڈوب کر یہ جاننا چاہتا ہے کہ کائنات کیا ہے اس کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ زمین و آسمان کی ماہیت کیا ہے۔ آسمان بغیر ستون کے کیسے قائم ہے زمین کا بچھونا کس طرح بچھا ہوا ہے۔ زمین سخت بھی ہے زمین نرم بھی ہے نہ اتنی نرم ہے کہ آدمی اس کے اندر دھنس جائے اور نہ اتنی سخت ہے کہ آدمی کا چلنا پھرنا اس کے اوپر محال ہو جائے۔ زمین کے اندر معدنیات اور نباتات کی کیسے تخلیق ہو رہی ہے۔ سائنسداں دیکھتا ہے کہ زمین ایک ہے، پانی ایک ہے، دھوپ ایک ہے، ہوا ایک ہے۔ لیکن جب یہی پانی زمین کے اندر سے پودوں اور درختوں کی رگوں میں دوڑتا ہے تو کہیں پھول بن جاتا ہے کہیں آم بن جاتا ہے تو کہیں انار کا روپ دھار لیتا ہے سائنس دان علت و معلول کی پیچیدہ گتھی کو سلجھاتا ہوا۔۔۔ کائنات کے آغاز سے بھی بہت پہلے سوچنے اور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کی پیدائش، ستاروں پر زندگی کے کیمیاوی اثرات، کرّہ ارضی پر، بلکہ بے شمار کرہ ارضی پر زندگی کا ظہور انسانی اور حیوانی تخلیق، کہکشانی لہروں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا اور دور ہونا۔ تابکاری، جوہری تقسیم و تحلیل کا جب وہ مطالعہ کرتا ہے تو اس کے اندر یقین کا ایک دروازہ کھلتا ہے اور یقین کے اس دروازے سے گزر کر جب مشاہدات کی دنیائیں اس کے سامنے آتی ہیں تو وہ یہ کہنے پر خود کو مجبور سمجھتا ہے کہ کائنات کے آغاز سے بھی پہلے کچھ تھا۔ کوئی تھا جس کے ہاتھ میں ان سارے کارخانوں کی کنجی ہے۔

سائنس دان کائناتی سنگلاخ چٹانوں، دہکتی ہوئی بھٹیوں، برفانی پہاڑوں، خلائی آلودگیوں اور زہریلی گیسوں سے گزر رہا ہے۔

ایک روز آئے گا کہ آج کا سائنس دان یہ اعلان کر دے گا۔

میں نے خدا کو دیکھ لیا ہے۔ میں نے خدا کو جان لیا ہے اور خدا ہی وہ ذات ہے جو کائنات کے آغاز سے پہلے سے ہے اور جس نے کہا تھا۔

''اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔''

اور اس نے کہا تھا۔

روشنی ہو جا اور روشنی ہو گئی۔

مذہب اور سائنس دو شعبے ہیں۔ ان شعبوں میں انسانی ادراک کی موشگافیاں جب اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہیں تو اُن راستوں پر چلنے والا کوئی فرد چونکہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا اس لیے مذہب سے انکار کر دیتا ہے یا سائنسی علوم کو ترقی معکوس کا نام دے کر مذہب کو قبول کر لیتا ہے۔

انسان عقل سے باہر کسی بات کو اس لئے تسلیم نہیں کرتا کہ عقل ساری زندگی پر محیط نظر آتی ہے جب وہ بولتا ہے کسی بات کو پرکھتا ہے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے یا آئندہ زندگی کے لئے کوئی فیصلہ کرتا ہے تب بھی عقل کی رہنمائی اس کی معاون بنتی ہے۔ عقل کی محیط کارفرمائی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مذہب کو بھی عقل کی بنیاد پر قبول کرے یا رد کر دے مذہب میں سب ہی کچھ ہے۔ اس میں یقین کے ساتھ وسوسے اور شکوک وشبہات بھی ہوتے ہیں۔ شک کا غلبہ ہو جائے تو ہم شکوک کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں یقین غالب آجائے تو ہمارے اوپر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مذہبی حلقوں میں جب ہماری توجہ مبذول ہوتی ہے تو عقل ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف مذاہب موجود ہیں اور ہر مذہب دوسرے مذہب کی شان کو گھٹانے کے لئے عقلی استدلال پیش کر رہا ہے۔ غیر جانبدار انسان جو موجودہ دور کے علم سے مالا مال ہے اور جسے مذہب کی تلاش بھی ہے، چاہتا ہے کہ حق وباطل کی تلاش میں مستند بات سامنے آئے۔ ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ صحیح طرز عمل یہ ہے کہ انسان بحیثیت مخلوق کے خالق کے روبرو حاضر رہے، گویا خالق اسے دیکھ رہا ہو اور وہ خالق کو دیکھتا ہو، خالق کو اپنی بات سنا سکتا ہو اور خالق کی بات سن سکتا ہو تو پھر یہ کیسا مذاق ہے کہ مذہبی لوگ ایک مرکز پر قائم نہیں ہوتے۔

عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ ازم، کنفیوشس ازم اور دوسرے تمام مذاہب ایک رب ایک خالق کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک ہی بات کا بار بار اعلان کرتے ہیں کہ تخریب ناپسندیدہ عمل ہے اور تعمیر پسندیدہ عمل ہے۔ پھر مذہبی لیڈر یہ کیوں کہتا ہے کہ میرے بتائے ہوئے راستے پر ہی چلنے میں نجات ہے۔ جب ہر مذہب اور مسلک کے راستے پر چلنے میں نجات ہے تو اتنے بے شمار مذاہب اور مسلک کو عقل کس طرح تسلیم کر سکتی ہے؟

کیا یہ طرز فکر صحیح نہیں کہ افراد یا اقوام کی مذہبی حیثیت کا اندازہ کرنے کے لئے پہلا سوال یہ ہونا چاہئے کہ کسی ایک فرد کے کیا جذبات ہیں۔ کسی مذہبی آدمی کے اندر کتنا یقین ہے اور کتنی مرکزیت قائم ہے؟ اس مرکزیت کا روح و جسم سے کیا تعلق ہے؟ ایمان کی کیا حالت ہے؟ خالق سے کس کا کتنا تعلق ہے؟ خالق کے فرستادہ بندوں کے بارے میں اسکے تاثرات کیا ہیں؟ خالق ایک ہے تو ساری مخلوق اس کا کنبہ ہے اور دنیا میں موجود ہر فرد اس کنبے کا فرد ہے۔

کیا ایسا ہونا عقلی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ مذہب کو سائنسی بنیادوں پر سمجھا جائے اور سائنسی بنیادوں پر مذہب کی عمارت کی تزئین کی جائے۔ اور عظیم سائنسدان، اللہ کو کائنات کی حیات کے اندر تلاش کیا جائے؟ کیا رات دن کا اختلاف، کہکشائی نظام اور ان نظاموں میں مسلسل

حرکت اس لئے قائم نہیں ہے کہ انسان ان کے اندر تفکر کرے اگر ہم خدا کو صرف عقیدے کی دوربین سے دیکھنا چاہیں اور یہ دیکھنا ہی تسخیر کائنات ہے تو یہ دیکھنا ہر گز دیکھنا نہیں ہے کیوں کہ اگر خالق کو اس دوربین کی حدود میں دیکھنا معراج ہے تو ماوراء عقلی ادراک کو خدا کے قریب ماننا پڑے گا۔ دوربین بجائے خود اس بات کی عقلی توجیہہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسا تصور بھی کام کرتا ہے جو نگاہ کو وسعت دینے کا مجاز ہے، لیکن ہم یہ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دوربین سے نظر آنے والی شے بہر حال ایک تخلیق ہے اور خود دوربین بھی تخلیق ہے اگر خالق کی ذات صرف اتنی وسیع اور عظیم ہے جو دوربین کے عدسے میں محدود ہو جائے تو پھر مذہبی آدمی کی حیثیت کوریاکاری کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

خالق اور مخلوق کا تذکرہ ہوتا ہے تو یہ بات امر لازم بن جاتی ہے کہ خالق کے اوصاف اور مخلوق کے اوصاف ایک نقطۂ مشترک نہیں ہو سکتے۔ خالق لامحدود ہے اور مخلوق محدود ہے۔

خالق وجود کو تخلیق کرنے والی ہستی کا نام ہے۔ اگر مخلوق خالق کی دی ہوئی عقل سے خالق کو سمجھنا چاہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک محدود شئے نہایت لامحدود ہستی ہو اپنی محدودیت میں داخل کرنا چاہتی ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک گلاس میں پورا سمندر انڈیل دیا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے (بقول ابن خلدون) کہ رتی ماشا تولنے والی عقل سے خدا کو سمجھ لیا جائے۔ تمام آسمانی کتابیں اور آخری کتاب قرآن برملا اعلان کرتی ہے کہ یہ ساری کائنات معین مقداروں میں تخلیق ہوئی ہے۔ ان معین مقداروں کو ہم سائنس کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔

غیر مستند اور ناقابل تسلیم لغویات اور مذہبی تنفر کو مذہب میں سے اگر الگ کر لیا جائے تو جو کچھ باقی رہ جائے گا وہ ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا جن مفروضات کی تصدیق حقائق سے نہیں ہوتی انہیں اگر رد کر دیا جائے تو مذہب ایک ایسی سائنس کی نشاندہی کرے گا جس میں ایمان ،ایقان، عفو در گزر، رحمت و مودّت اور بھائی چارے کے علاوہ کچھ نہیں رہے گا۔ مذہب کی اساس اتحاد کی اساس بن جائے گی تو انسان کا ضمیر مطمئن ہو جائے گا اور یہ دنیا امن و آتشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔

اگر دوسرے علوم کی طرح خالق کائنات کے ارشادات کی روشنی میں مذہبی سائنس بھی مرتب ہو جائے تو اس کو اس سے کہیں زیادہ قبول عام حاصل ہو گا جو آج کی سائنس کو حاصل ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے گا تو عوام مشاہداتی تجربات اور حقائق سے واقف ہو جائیں گی۔

مذہب کے بارے میں ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہے کہ لوگ دیکھے بغیر محض دوسروں کے کہنے پر یقین کر لیتے ہیں۔ جب مذہبی رہنما فیزیکل سائنس (PHYSICAL SCIENCE) کی طرح مذہب کی بارے میں اپنی ریسرچ کی بنیاد پر تسخیر کائنات کے فارمولے تلاش کر لیں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ نوع انسانی اسے قبول نہ کرے۔

مذہب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ ایک ذات "خالق" پر انسان کو ایمان و یقین کامل ہو اور وہ ذات جس طرح کہے اس پر عمل کیا جائے ۔ واحد ذات "خالق" نے ہر مرحلے میں دعوت دی ہے کہ اس کی پھیلائی ہوئی کائنات میں تفکر کیا جائے کیوں کہ تفکر کائنات کی بساط ہے۔

سائنس اور مذہب میں یہ فرق ہے کہ سائنس دان محض عقلی بنیاد پر کائنات کی تلاش میں مصروف ہیں جب کہ مذہب کا دعویٰ ہے کہ عقل بھی ایک تخلیق ہے عقل کا وجود نہ ہو تو تخلیق اور تلاش معدوم ہو جائے گی۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عقل بھی ایک تخلیق ہے تو ہماری لئے مجبوری ہے کہ ہم یہ بھی سوچیں کہ عقل کس طرح وجود میں آئی؟ اس وجود کو کہاں سے فیڈنگ (FEEDING) مل رہی ہے؟ کون ہے جو عقل تقسیم کر رہا ہے؟ اور وہ کون سی اعلیٰ وارفع ذات ہے جو عقل سلب کر لیتی ہے۔ تو کائنات میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو دماغ (BRAIN) کی موجودگی کے باوجود عقل و شعور کی ہنگامہ خیزی ختم کر دیتی ہے ہے۔

کیا ہم نہیں دیکھتے کہ آدمی کے اوپر شعوری دروازے (موت) بند ہو جاتے ہیں اور دماغ محفوظ رہتا ہے لیکن عقل و شعور کی کارگزاری معطل ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک کی ان آیات کو جن میں تسخیر کائنات کے علوم کا ذخیرہ ہیں، اگر بنیاد بنا کر تحقیق کا کام شروع کر دیا جائے تو مذہبی سائنس کا ارتقاء نہایت آسانی سے شروع ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہو گیا خدا کرے ایسا ہو جائے تو تاریخ پھر ایک بار خود کو دہرائے گی اور یورپ کے سائنسدان حقیقی سائنسی علوم حاصل کرنے کے لئے مذہب کی طرف لازماً رجوع کریں گے۔

سائنسی ایجادات نے بے بلاشبہ منکشف کر دیا ہے کہ زمین پر موجود مخلوقات میں انسانی مخلوق صلاحیتوں اور بصارت کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے افضل اور برتر ہے۔ ہم جب قرآن کے حوالے سے سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ تفکر ملتا ہے کہ انسان کے اندر ایک شعور اور تین لا شعور ہر وقت متحرک رہتے ہیں چار شعوروں میں سے فقط ایک شعور سے عوام واقف ہیں۔ بقیہ تین شعور عامۃ الناس کے تعارف میں نہیں ہیں سائنس دان صدیوں کی مسافت طے کر کے اور اربوں کھربوں ڈالر خرچ کر کے دوسرے شعور سے کسی حد تک واقف ہو گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آج کی سائنس نے دوسرے شعور کو تلاش کر لیا ہے اور سائنس دان اس کوشش میں ہیں کہ دوسرے شعور کی کنہ تک پہنچ جائیں۔ سائنس دان اس دوسرے شعور کو لاشعور کا نام دیتے ہیں۔ لیکن قرآن پاک شعور سوئم اور شعور چہارم کا بھی تعارف کراتا ہے چنانچہ ان دو شعوروں کو بھی ہم لاشعور ہی شمار کریں گے۔ اس طرح کائنات کی ساخت میں تین لاشعور پائے جاتے ہیں۔ پہلا لاشعور، دوسرا لاشعور، تیسرا لاشعور، ان چاروں شعوروں میں چوتھا اور آخری شعور لامکان ہے اور باقی تین شعور مکان ہیں۔

زندگی کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کائنات میں موجود کوئی چیز بے رنگ نہیں ہے ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شئے کسی نہ کسی رنگین غلاف میں بند ہے یہ رنگین غلاف AURA ہی کسی شئے کی انفرادیت قائم کرتا ہے۔

آیئے! آرام وسکون کے ساتھ ذہن کو خیالات سے آزاد کر کے ذرا کائناتی رموز پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ کائنات میں کوئی ایسی شئے ہے جو رنگین نہ ہو۔ چیونٹی سے ہاتھی تک چھوٹے سے پودے سے پیپل جیسے بڑے درخت تک، زمینوں پر موجود کوتاہ قد انسان، طویل القامت انسان، مشرق میں مغرب میں، شمال میں جنوب میں بسنے والے انسان اور انسانی زندگی میں کام کرنے والے تمام وسائل، لامتناہی رنگوں کا ایک سلسلہ ہے۔ روحانی سائنس کا طالب علم جب روحانی سائنس کی کلاسیں پڑھتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ فرد لاشمار رنگوں کا مجموعہ ہے یہ رنگ شعور اول کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان رنگوں کا تعلق تین لاشعوروں سے ہے جو ہماری نظروں سے مخفی ہیں۔

سائنس دانوں نے جب پہلے شعور سے نکل کر دوسرے شعور یعنی لاشعور میں قدم رکھا تو ان کے اندر وہ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں جن صلاحیتوں سے آج کی ایجادات وجود میں آئیں اس بصیرت یا صلاحیت سے سائنس دانوں نے ایجادات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا، ایجادات میں ایک ایجاد کیمرہ ہے۔ لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کو وہ بصیرت حاصل نہیں ہوئی جو اس کی اپنی بنائی ہوئی آنکھ کو آنکھ نہیں بنا سکی کیمرے کی آنکھ ہمارے سامنے لے آئی ہے یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کیمرے کی آنکھ یہ دیکھ لیتی ہے کہ کونسی چیز کتنی سست کتنی تیز رفتار کتنی بڑی اور کتنی چھوٹی ہے۔ کتنی دور یا کتنی نزدیک ہے۔ کیمرہ تمام اعداد و شمار نکال کر ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

ریڈیو دوربین، کروڑوں اربوں میلوں پر واقع کہکشاؤں سے اٹھنے والی طول طویل امواج کا سراغ لگا لیتا ہے انسانی دماغ یعنی دوسرے شعور، یا انسان کے لاشعور کی ایجاد کمپیوٹر، معلومات کو دیکھ لیتا ہے اور دیکھ کر ان کی تصویریں بنا دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی فوٹو گرافی کی سائنس نے اتار کر پھینک دی ہے۔ فضا میں چھوڑا ہوا ایک سیارچہ مائیکرو ویو، اخراجات کا ریکارڈ کر لیتا ہے انسان کے دوسرے شعور یعنی لا

شعور میں حرکت پیدا ہوئی تو الیکٹرانی خورد بین ایجاد ہوئی۔ اس الیکٹرانی خورد بین سے مکھی کے جسم کے ایک معمولی بال کو ایک فٹ لمبا کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ سکائی لیب میں لگے ہوئے بالائے بنفشی سراغ رساں کیمرے نے سورج کے اندر دیکھ کر اس کی شدید ترین آتشیں حرکتوں اور بھونچالوں کی تصویریں اتار رکھی ہیں۔

شعور دوئم یعنی لاشعور حرکت میں آیا تو ایکسرے ایجاد ہوا۔ ایکسرے انسانی جسم کے اندر کی تصویر اتار کر معالج کو فوراً بتا دیتا ہے کہ کون سی ہڈی کہاں سے ٹوٹی ہوئی ہے اور کون سا جوڑ کہاں سے ہل گیا ہے۔ تابکار شعاعوں کی مدد سے سونے اور دوسری دھاتوں کی اندرونی دنیا کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

ماہرین بحریات، بحر الکاہل کے مشرقی حصے میں دو ۲ دو ۲ میل گہرائی میں جا کر وہاں کی منجمد خاموش اور تاریک فضا کی فلمیں اتار رہے ہیں شعبہء طب میں ایسے نازک کیمرے نصب ہیں جو بچے کی ولادت کا پورا منظر فلم پر اتار لیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں بچے کی طرف کس مامتا سے دیکھتی ہے۔ بچہ اپنی آنکھ پہلی بار کب اور کس طرح جھپکاتا ہے۔

مختلف ساختیں، مختلف میدان، مختلف زندگی کے شعبے، مختلف کام، ان سب میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ سب انسانی لاشعور کی کارفرمائی ہے۔ یہ سب ایجادات، یہ سب رنگ آمیزی، یہ سب محیر العقول کارنامے۔۔ یہ سب وسائل کی تسخیر اس لئے ہے کہ سائنس دان اپنے اندر کام کرنے والے چار شعوروں سے واقف ہونے کے راستے پر گامزن ہیں۔

میرے عزیزو۔۔ میرے ساتھیو۔۔ میرے بھائیو۔۔ اگر ہم روحانی سائنس کی سیڑھیوں پر چل کر اس عمارت تک پہنچ جائیں جو عمارت چار شعوروں سے مرکب ہے تو یقیناً ہمارا مقام سائنسی دور میں بہت بلند ہو جائے گا۔

ہمارے آقاؐ ہمارے نجات دہندہؐ۔ ہمارے ہادیؐ۔ ہمارے روحانی باپؐ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمارے لئے روحانی سائنس کا ایک مکمل کورس ورثے میں چھوڑا ہے یہ ورثہ قرآن ہے۔ جو ہمیں چار شعوروں سے واقف ہونے کی ہدایت بخشتا ہے۔ تمام انبیاء مرسلینؑ نے نوع انسانی کو ایک شعور اور دو لاشعوروں سے متعارف کرایا ہے او حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شعور اور تین لاشعوروں سے متعارف کرایا ہے۔

"ہمارے پاس سائنسی علوم کا جتنا بڑا ذخیرہ ہے آج کا سائنس دان ابھی اس سے واقف بھی نہیں ہے۔ قرآن میں تفکر اگر ہمارا شعور بن جائے اور اللہ کی نشانیوں میں ہم بصیرت سے کام لیں تو کائنات کے اسرار و رموز ہمارے اوپر کھل جائیں گے اور ہم قرآنی سائنس سے کائنات پر حکمرانی کریں گے۔"

## مکتوبات مرشد

تحریر۔ باجی سعیدہ خاتون

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہے جس نے انسان کو اپنی ذات وصفات کے علوم عطا کیے اور رگ جاں سے قریب ہو کر اسے اپنا ادراک عطا فرمایا۔ادراک کے سمندر کی یہ ننھی سی بوند ساحل سے ٹکرا کر پھر سمندر کی آغوش میں مل جانے کو مچلتی رہتی ہے۔سمندر سے بچھڑ کر ہی اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بقا کا انحصار سمندر پر ہے۔ تلاش حق کی راہ پر چلنے والا بندہ پانی کی اس بوند کی مانند ہے جو بپھری ہوئی موجوں سے جدا ہو کر ساحل پر آن پڑتی ہے۔ جب تک وہ موج کے ساتھ تھی اس کی قوت اس کی صورت خود موج مستی تھی اور اب اپنی حیات اپنی بقا اور اپنے تحفظ کے لئے موج کی محتاج ہے۔

روحانیت کے سفر پر سالک کی حیثیت ایک کم سن بچے کی سی ہے جسے ہر قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہے۔مرشد روحانی دنیا کے اس کم سن شعور کو اس طرح پروان چڑھاتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ روحانی دنیا کا بالغ شعور بن جاتا ہے اور حواس کے ذریعے رگ جاں سے قریب تر بسنے والی ہستی کا ادراک کر لیتا ہے۔مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی نے روحانی توجہ اور تصرف کے ساتھ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی میری رہنمائی کی ہے۔مرشد کریم کی تحریر کا ہر لفظ اور ہر جملہ بہ اعتبار معنی ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے آج میرا جی چاہتا ہے جس طرح ان تحریروں نے میرے ذہن ودل کے بند دروازے کھول دیئے دوسروں کو بھی ان سے وہ روشنی اور نور عطا ہو جائے جس روشنی میں روح کی نظر اپنے رب کی صناعی کا مشاہدہ کرتی ہے۔

کراچی میں میری روحانی تعلیم کے سلسلے میں مرشد کریم نے جو پہلی تحریر اپنے دست مبارک سے لکھی وہ یہ ہے۔

"باادب بانصیب بےادب بےنصیب"

فرمانے لگے "روحانی دنیا میں داخل ہونے والے بندے کا پہلا سبق یہی ہے۔اگر آپ نے ان الفاظ کو ذہن نشین کر لیا تو اللہ کے راستے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

مرشد کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میری روح کی گہرائیوں میں اس طرح داخل ہو گئے جیسے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جس کا احساس جسم کے اندر باہر روئیں روئیں میں پھیل جاتا ہے۔میرے وجود کا ہر ذرہ مرشد کریم کے حکم پر نہایت ادب واحترام کے ساتھ مستعد ہو گیا۔میں سوچنے لگی ادب واقعی خوش نصیبی کے دروازے کھولتا ہے۔اولاد اپنے ماں باپ کا ادب کرتی ہے تو ان کی فرمابرداری اس پر آسان ہو جاتی ہے۔اولاد ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔وہ اسے نہایت پیار کے ساتھ اپنے کلیجے سے لگائے رکھتے ہیں۔اپنا آرام تج کر اسے آرام پہنچاتے ہیں۔اپنی ناکامیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی کوششوں کو کامیاب بناتے ہیں۔ماں باپ کے ساتھ ادب وسلوک اولاد کو دلی سکون اور تحفظ عطا کرتا ہے۔وہ زندگی کے ہر قدم پر کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔اور زندگی کی آسائشیں اور خوشیاں اس کا نصیب بن جاتی ہیں۔ادب ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کے اندر عاجزی وانکساری کے احساس کو ابھارتا ہے جس سے انسان کی انا اور غرور ختم ہو جاتا ہے۔غرور نار ہے۔جو ابلیس کی صفت ہے۔ابلیس اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔غرور آدمی کے اندر نافرمانی کی صلاحیتیں ابھارتا ہے اور نافرمان آدمی کبھی بانصیب نہیں ہوتا۔ آدم کی نافرمانی نے اسے بے یقینی کے گڑھے تک پہنچایا۔آج بنی نوع انسانی اسی غلطی کی پاداش میں بے یقینی، بے سکونی اور عدم تحفظ کا شکار ہے۔آدم کی نافرمانی آدم کے نفس کی کمزوری ہے۔پس کمزور نفس کے لیے عاجزی وانکساری اختیار کرنا ہی زیبا ہے۔شاگرد جب استاد کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کر لیتا ہے کہ وہ استاد کے علوم میں سے کچھ نہیں جانتا تو استاد اسے اپنے علم سکھا دیتا ہے۔ اگر شاگرد استاد کے سامنے بےادب ہو کر اپنی علمی قابلیت بیان کرنے لگے تو استاد علم کے دروازے اس کے لیے نہیں کھولتا۔استاد محترم کا یہ پہلا سبق

زندگی کے ہر قدم پر مشعل راہ ثابت ہوا۔ آج بھی ذہن کے پردے پر یہ تحریر اس طرح نقش ہے کہ جس کے آگے سرکش نفس زانوئے ادب تہیہ کیے ہوئے ہیں اور مرشد کریم کے علم کے آفتاب نے نصیب کو چاند کی مانند روشن کر دیا ہے۔

قبلہ الشیخ عظیمی کی ہر بات میں اس قدر گہرائی ہوتی ہے کہ جس وقت بھی وہ بات یاد آجائے یا تحریر نظر سے گزرے ہر بار ذہن اس میں نیا مفہوم اور نئے معنی تلاش کر لیتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا۔۔۔

"میں تو یہ سمجھا ہوں کہ دنیا والے محبت سے واقف نہیں ہیں۔ دنیا کے نزدیک محبت کا تصور یہ ہے کہ لوگ ہمیں چاہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالی بندوں کو خود چاہتے ہیں۔ یہ طلب نہیں رکھتے کہ کوئی اللہ کو چاہے۔ یہ جو تقاضہ ہے کہ کوئی مجھے چاہے، دراصل اسی نقطہ سے حقوق کا جال بنتا ہے۔ یعنی اپنی جانب کے نقطہ آغاز سے ہر شخص دوسرے شخص پر اپنے حقوق عائد کر دیتا ہے اور خود اپنے اوپر دوسروں کے حقوق تسلیم نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسا تصور ہے کہ آدم خود غرضی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ سڑاند اور تعفن سے بنا ہوا آدمی خدائی کا دعویٰ کر دیتا ہے۔ کوئی نمرود بن جاتا ہے، کوئی شداد بن جاتا ہے۔"

اس عبارت پر اگر عقل سلیم کے ساتھ غور کیا جائے تو اللہ تعالی کے قانون کی باریکیاں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ اللہ کی سنت میں ردوبدل نہیں ہے۔ اللہ کی سنت قوانین فطرت کی صورت میں کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اللہ خود اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔ وہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ مخلوق اس سے محبت کرے یا نہ کرے۔ اللہ کی ہر سنت ہر فرد کا فطری تقاضا ہے۔ یعنی ہر فرد کے نقطہ ذات کے اندر اللہ تعالی کے تفکر کے انوار کام کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہر تفکر علوم کائنات ہے۔ نقطہ ذات کے اندر اللہ تعالی کے تفکر کے انوار کی حرکت ذات کا تقاضا پیدا کرتی ہے۔ نقطہ ذات کے اندر پیدا ہونے والا ہر تقاضہ فطرت ہے۔ فطرت کا یہی اصول اللہ تعالی کی سنت ہے جس میں ردوبدل یا تعطل واقع نہیں ہوتا۔ اللہ کی ذات ہر ذرے میں یکساں طور پر کام کر رہی ہے۔ جب آدمی فطرت کے اصول کے مطابق اپنے ذہن کو حرکت دیتا ہے تو اللہ کی سنت کے مطابق انسان کے ذہن کی حرکت لا محدودیت میں کام کرتی ہے۔ کیونکہ آدمی کا ذہن تو اللہ کے نور سے فیڈ ہوتا ہے۔ ذہن یا دماغ کی فکر کی روشنی اس کی ذات کے محدود ترین مقام سے گزر جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ذہن پر کوئی فکر یا تقاضا بار نہیں گزرتا۔ قلب پر سکون رہتا ہے اور طبیعت میں استغناء پیدا ہو جاتا ہے۔ آدمی کو اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی اس کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہے۔ اس کی نظر صرف اپنی ہی ذات اور اپنے ہی گریبان میں دیکھتی ہے۔ اللہ کی سنت پر عمل کرنے سے آدمی کے اندر اللہ کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ بندہ جب اس سنت کو جان کر اس کے اوپر خلوص نیت سے عمل پیرا ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالی خود اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اور مخلوق کی محبت کا محتاج نہیں ہے۔ نہ ہی وہ اپنی محبت کے عوض مخلوق سے محبت کا طلبگار ہے۔ تو آدمی خود اللہ تعالی کی سنت کے مطابق عمل کر کے اس کی مخلوق سے اس طرح محبت کرتا ہے کہ دوسرے سے اپنی محبت کا معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ خواہ وہ اولاد ہو، بہن بھائی ہو، ماں باپ ہو، دوست ہو کوئی بھی ہو۔ ایسی بے لوث محبت اللہ کی صفت کا نور ہے اس نور کی روشنی سے آس پاس رہنے والے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کا نور ہر حال میں غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے لوث محبت کرنے والی ماں کی اولاد نیک اور سعادت مند ہوتی ہے۔ خلوص دل سے ایثار و قربانی اور شفقت و محبت کرنے والی ساس پر بہوئیں جان چھڑکتی ہیں اور گھر جنت بن جاتا ہے۔ گھر کا ہر فرد یکساں طور پر اپنی جنت کو سنوارنے اور اس کی نگہبانی کے فرائض ادا کرتا ہے۔ مرشد کریم سچ ہی تو کہتے ہیں کہ آدمی محبت سے واقف ہی نہیں ہے۔ محبت دوسرے سے طلب نہیں کی جاتی بلکہ خود کی جاتی ہے۔

اسی بات پر مرشد کریم الشیخ عظیمی کا قول یاد آگیا۔ "میگنیٹ لوہے کو کھینچتا ہے اور لوہا سمجھتا ہے کہ میں میگنیٹ کی طرف دوڑ رہا ہوں۔"

اس پر مغزبات میں کس قدر گہرائی ہے۔اللہ ہی کی محبت ہمیں اللہ کی طرف کھینچتی ہے۔ہر صفت اللہ ہی کی ہے۔محبت اور عشق تو ایک کشش ہے۔یہ کشش ذات کی ہے۔جیسے میگنٹ کی کشش کے اندر جب لوہا آجاتا ہے تو لوہے کی اپنی طاقت اور فورس مغلوب ہو جاتی ہے اور میگنٹ کی فورس یا کشش لوہے کو اپنی ذات سے قریب کر لیتی ہے۔میگنٹ کے قریب ہونے کے لیے پہلے لوہا بننا ضروری ہے یعنی میگنٹ کی کشش کے آگے لوہا اپنے آپ کو قطعی طور پر بے بس بنالیتا ہے۔اپنے اندر کی تمام قوت کی نفی کر کے میگنٹ کی کشش کو قبول کر لیتا ہے۔جب ہی تو وہ میگنٹ سے مل جاتا ہے۔پس اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ذات کی نفی کرنا لازم ہے۔قانون قدرت ہے کہ جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو آگ کی گرمی کو اس حد تک جذب کر لیتا ہے کہ خود آگ بن جاتا ہے۔میگنٹ کی قربت لوہے کو بھی میگنٹ بنادیتی ہے۔اللہ کے بندے جب اللہ کی محبت میں اس سے قریب ہو جاتے ہیں تو ان کے ہر قول اور ہر فعل میں اللہ کی ضمانت اور مخلوق کی شہادت شامل ہو جاتی ہے۔

عشق کی کشش کی بات چل نکلی تو مرشد کریم کا ایک خط سامنے آگیا۔انہوں نے حضرت سرمد شہید کی ایک رباعی لکھی ہے۔

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار
ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

آپ اس کا مطلب یوں لکھتے ہیں کہ

"سرمد عشق ہر جائی لوگوں کو نہیں دیا جاتا۔پروانے کے دل کا سوز مکھی کو کب نصیب ہوتا ہے؟ یار کو آغوش میں سمیٹنے کے لیے صدیاں بیت جاتی ہیں اور جس کو یار مل جاتا ہے وہ عالم میں ممتاز ہو جاتے ہیں۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں

"پتہ نہیں عشق کو غم اور دل کی لگن کو سوز کیوں دیا گیا ہے۔اگر عشق واقعی آگ ہے تو پھر وہ عشق نہیں ہے۔عشق میں تو انگ انگ زعفران زار بن جاتا ہے۔دل میں گداز داخل ہو جائے تو آدمی کے اوپر عالمین کی تخلیق کے فارمولے کھل جاتے ہیں۔"

میرے لیے مرشد پاک کا ہر لفظ علم کا ایک دفتر ہے۔ہر بار آپ کی تحریر نئے معنی و مفہوم کے ساتھ ذہن کے پردے پر جلوہ گر ہوتی ہے۔

عشق تو اللہ کی صفت ہے۔اللہ کا نور ہے اللہ کی ہر صفت نور ہے۔اللہ جب نار نہیں ہے تو عشق کیسے نار بن سکتا ہے۔جو آدمی عشق کو نار اور سینے کی جلن سمجھتا ہے،دراصل اس کا دل عشق کے نور سے خالی ہے۔کیونکہ نور اور نار ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔جس دل میں عشق الٰہی کے انوار ذخیرہ ہو جاتے ہیں وہ دل تجلی کا ایک ایسا نقطہ بن جاتا ہے جس نقطے میں اللہ کے تفکر کی رو بہنے لگتی ہے اللہ کا ہر تفکر علم کائنات ہے۔عشق الٰہی کا نور قلب میں جذب ہو کر قلب کی آنکھ بن جاتا ہے۔قلب کی آنکھ اللہ کے نور سے غیب کے عالمین کو دیکھتی ہے اور اللہ کی نعمتوں کو دیکھ کر غم نہیں بلکہ سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔جو عشق سینے میں رقابت کی آگ کو بھڑکائے اور دلوں میں حسد پیدا کرے اس کو بوالہوسی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ایک اور خط میں حقیقی اور فکشن حواس کا تذکرہ اس طرح فرمایا۔

"یہ ساری کائنات ایک اسٹیج ڈرامہ ہے اللہ میاں چاہتے ہیں کہ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ اپنے پورے کرداروں کے ساتھ چلتا رہے۔جب یہاں ہر شئے ڈرامہ اور فکشن ہے تو ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم کسی خیال سے ناخوش ہوں اور یہ جو شیطان ہے نا، یہ بڑا ظالم ہے۔ہمیشہ آدمی کے اندر وسوسہ

اور شک ڈالتا ہے تاکہ شک آدمی کے اندر سے اپنے یکسو ہونے کا یقین کمزور کر دے۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غصہ آتا ہے سبقت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ خود کا اور دوسروں کا موازنہ کرتا ہے اور ان نعمتوں کو جو اسے حاصل ہیں کم سمجھنے لگتا ہے۔

مرشد کریم کی بات کتنی سچی ہے اس بات سے واقف ہوتے ہوئے بھی کہ دنیاوی زندگی محض عارضی ہے اس دنیا کی ہر شئے فانی ہے اس کے باوجود بھی جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لوگ اس طرح ناخوش ہو جاتے ہیں جیسے زندگی میں کبھی خوشی دیکھی ہی نہیں۔ اس لمحے ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جس طرح یہ مادی دنیا فانی ہے اسی طرح یہاں کی ہر شئے خوشی غم بھی فانی ہے۔ فنا ہونے والی شئے میں تغیر و تبدل واقع ہوتا رہتا ہے۔ حرکت کا نام ہی فنائیت ہے۔ کائنات فانی اس وجہ سے ہے کہ اس کے اندر ہر لمحہ تغیر ہو رہا ہے۔ حرکت کے عمل سے جو تغیرات ہوتے ہیں اسی کا نام فنائیت ہے۔ دنیا دی حواس کی بنیاد ہی فنا پر ہے اگر خوشی ختم نہ ہو تو غم کا احساس کیسے ہو۔ غم کا احساس ہی آدمی کے اندر خوشی کی طلب پیدا کرتا ہے اور فنا کو چھوڑ کر بقا کے راستے کی تلاش کی جستجو دلاتا ہے۔ اگر ہم ان فکشن اور مفروضہ حواس کو حقیقت سمجھ کر اپنا لیتے ہیں تو پھر ہمارے اوپر زمان و مکاں کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے کیونکہ شعوری حواس ٹائم اور اسپیس کی حدود میں کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ناکامی کے غم کو ہم حقیقت سمجھ کر سینے سے لگا لیتے ہیں تو غم ہمارے باطن میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ جتنی گہرائی میں کوئی بات اترے گی اس کا اثر بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔ گویا شعوری حواس کے تمام دائرے اس رنگ سے رنگین ہو جاتے ہیں اور پھر ذہن کے ہر خیال پر اس فکر کا رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ جیسے لال رنگ کا چشمہ لگانے سے ہر شئے لال نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کا طبعی رنگ کچھ اور ہوتا ہے اسی طرح فکشن اور مفرضہ حواس بھی دنیاوی رنگوں کے چشمے ہیں۔ کبھی کوئی رنگ نظر کے سامنے آجاتا ہے اور کبھی کوئی رنگ۔ رنگوں کے اس ہجوم میں وحدت نظر اس طرح اپنے آپ کو چھپا لیتی ہے کہ پھر اسے دیدۂ بینا ہی تلاش کر سکتا ہے۔

تو خود ہی سوز باطن سے نکال اک شمع غیر فانی

چراغ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے

دنیا کثرت ہے۔ جہاں کثرت ہے وہاں وحدت نہیں ہو سکتی۔ جہاں فنا ہے وہاں بقا نہیں ہو سکتا۔ جہاں حرکت اور تغیر ہے وہاں اللہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ واحد ہے۔ اللہ باقی ہے۔ اللہ قائم ہے۔ یہ مفروضہ اور فکشن حواس آدمی کو اس وجہ سے عطا کیے گئے کہ آدمی اپنے انفرادی شعور کے ساتھ قدم قدم چلتا ہوا اس حقیقت سے ہمکنار ہو جائے تو حقیقت اس انفرادی شعور کی خالق ہے۔ اگر انفرادی شعور نہ ہوتا تو سب کچھ اللہ ہی اللہ ہوتا۔ پھر کائنات اور کائنات کے افراد کا تذکرہ نہ ہوتا۔ کاش بنی نوع انسان اس حقیقت کو پہچان لے کہ فناء کا قافلہ بقا کے دوش پر اڑا چلا جا رہا ہے۔

مکّہ ۵۱۱/ء میں عربستان کا سب سے بڑا تجارتی اور مذہبی مرکز تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی عبادت گاہ بھی اسی شہر میں تھی۔ یہودی مذہب رائج ہو چکا تھا۔ البتہ عیسائیت نے عربستان میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ پتھروں کے بتوں کی پوجا اتنی بڑھ گئی تھی کہ سال کا ہر دن کسی نئے بت کی پوجا کے لیے مقرر تھا۔ ہر طرف بت پرستی عام تھی۔ بت پرستی کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی رائج ہو گیا تھا کہ دیوتا ہی لوگوں کی تقدیریں بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اس ظلمت اور اندھیرے میں کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو یقین اور غیر یقین کے درمیان خدائے واحد کا تصوّر رکھتے تھے۔ مکّے کی تپتی اور جھلستی زمین پر ایک ایسی ہستیؐ متعارف ہوئی جس کو بت پرستی سے شدید نفرت تھی۔ اس ہستی نے چالیس برس کی عمر میں توحید کا پیغام پہنچانے کی مہم شروع کی۔ بت پرستی کو مٹانے اور توحید پرستی کو قائم کرنے کا جیسے ہی لوگوں کو پیغام پہنچا، لوگ اس ہستی کے مخالف بن گئے اور انھیں طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مصیبتوں اور پریشانیوں کا سلسلہ یہاں تک دراز ہوا کہ انہیں اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب فتح و کامرانی شروع ہوئی تو اُن کے پیروکاروں نے صرف پانچ برس کی مدّت میں ایران اور روم کی فوجوں کو شکست دیدی۔ آٹھویں صدی عیسوی تک وسطی ایشیاء سے اسپین اور مغربی افریقہ تک اسلام پھیل گیا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، جابر اور ناکارہ مسلم حکمرانوں کے ساتھ ساتھ اسلام کی حکمرانی ختم ہو گئی۔ لیکن آج بھی نوّے کروڑ انسانی دماغوں پر اسلام کے بانی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقش قائم ہے۔ اسلام کی ہر دلعزیزی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اسلام میں نسبی منافرت کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلامی فتوحات پر تاریخی صفحات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں چھوت چھات اور تفرقے اور نسلی منافرت اپنے عروج پر تھی۔ جہاں جہاں بھی اسلام پہنچا ان لوگوں نے اس کا استقبال اس لیے کیا کہ اسلام نے چھوت اچھوت، نسلی منافرت اور تفرقوں سے خود کو الگ بتایا۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہن لوگوں نے بھائی چارہ، اخوت و محبت اور برابری کا جو رویّہ اختیار کیا اس سے دوسری قوموں کے لوگ متاثر ہوئے اور اسلام میں اس طرح داخل ہوئے کہ بقول علامہ اقبالؒ ایک سیلِ کارواں بن گیا۔

بوسیدہ لباس اور مفلوک الحال مختصر اسلامی فوج کو دشمن کے مقابلے میں اس لیے فتح و نصرت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا۔ اور وہ مقصد یہ تھا کہ زمین پر بسنے والا ہر انسان آدم و حوّا کے رشتے سے ہمارا بھائی ہے۔ جیسے جیسے مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا۔ ان کے اندر دنیا کی طلب اور آرام و آسائش کی زندگی اس طرح داخل ہو گئی کہ ان کے ذہن میں بھی دوسری اقوام کی طرح چھوٹے اور بڑے کا احساس اُبھر آیا۔ اور اس احساس نے قوم کے اندر نسلی منافرت کا بیج بو دیا۔ چونکہ اسلام میں نسلی منافرت کی سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے، اس لیے یہ طرزِ فکر تفرقوں میں تبدیل ہو گئی۔ اسلام کے عروج سے پہلے جس طرح غیر مسلم قومیں نسلی منافرت میں مبتلا تھیں اسی طرح مسلمان تفرقوں میں بٹ گیا۔

کوئی غیر جانب دار شخص جب تاریخ عالم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے اور اس مطالعے سے نتیجہ اخذ کرتا ہے تو صرف یہ بات سامنے آتی ہے کہ بت پرستی بھی نسلی منافرت کا نتیجہ ہے۔ نسلی منافرت اتنی پھیلی کہ سال کا ہر دن دیوی دیوتا کے نام سے موسوم ہونے لگا اور آدم زاد برادری میں ۳۶۵ گروہ بن گئے اور ہر گروہ نے اپنا ایک خدا بنا لیا۔

اسلامی تاریخ کا ابتدائی دور مسلمان برادری کے عروج کا دور ہے۔ اس دور میں انسانی برادری کے دو گروہوں کا سراغ ملتا ہے۔ ان دو گروہوں نے دو فلسفوں کی نشاندہی کی۔ یہ دونوں فلسفے دو جہات کا تعین کرتے ہیں۔ ایک گروہ زمین کی پیدائش، کائنات کی ساخت اور اجرامِ فلکی کی رفتار کو سمجھنے کے لیے زمین سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ جب تک کوئی چیز مشاہدے میں نہ آجائے اور اس کی مادّی توجیہہ بیان نہ کر دی جائے اس

وقت تک کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہے۔زمین سے آسمان کی طرف سفر کرنے والا گروہ مادّی مظاہرات کو بنیاد قرار دیتا ہے۔یہ گروہ کہتا ہے (Matter)مادّہ نہ ہو تو مادّے میں شکست وریخت بھی نہیں ہو گی۔اور جب مادّہ ٹوٹ کر اور بکھر کر ذرّات میں تبدیل نہیں ہوتا تو زمین پر موجودات کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔

اس کے برعکس آسمانوں کی رفعت سے پستی میں زمین کی طرف دیکھنے والا گروہ کہتا ہے۔

''ساری کائنات ایک قاعدے اور قانون کے تحت حرکت کر رہی ہے اور اسی مکمل ضابطۂ حیات کے تحت کائنات کی ہر شے اور شے کے وجود کا ہر ہر عضو بحسن وخوبی بر سر عمل ہے۔''

اس گروہ کے مشاہدے میں یہ بات آجاتی ہے کہ کائنات کی کوئی شے جب قانونی ضابطوں سے ہٹ جاتی ہے تو اس کا وجود اوجھل ہو جاتا ہے۔اس گروہ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ اشیاء میں چند وجود ایسے بھی ہیں جنھیں بظاہر اختیار دیا گیا ہے۔لیکن یہ اختیار چونکہ کسی کا دیا ہوا ہے اس لیے اس کی حیثیت بھی غیر اختیاری ہے۔اور جب قانونِ قدرت کے فارمولے ان کے سامنے آجاتے ہیں تو وہ خود کو ایک ماوراہستی کے سپرد کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔یہ ساری کائنات جس کا کنبہ ہے۔کنبے کا سربراہ یہ نہیں چاہتا،کنبے اور برادری میں حقارت، نفرت اور افتراق پیدا ہو۔ہر باپ کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد محبت اور اخوّت کے بندھن میں بندھی رہے۔کنبے کی سربراہ ہستی اللہ کے سب سے بڑے چہیتے محبوب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی پیغام نوعِ انسانی کو پہنچایا ہے اور ہزارہا صعوبتوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کر کے زندگی بھر اس پروگرام پر عمل کیا ہے۔

جب تک مسلمان قوم میں یہ اسلامی مزاج اور طرزِ فکر موجود رہی۔دنیائے عالم پر اسلام کی حکمرانی قائم رہی اور جب مسلمان نے اپنے اسلاف کے ورثے اسلامی مزاج کو بالائے طاق رکھ کر تفرقے کا طوق گلے میں ڈال لیا تو اس سے دنیائے عالم کی حکمرانی چھن گئی اور اس کا شمار آسمانی گروہ میں نہیں رہا۔آسمانی گروہ سے تعلق ٹوٹنے کے بعد اس کے اوپر مادّی مزاج گروہ کا غلبہ ہو گیا اور کل کا حکمراں آج غلام بن گیا۔ادبار، مفلوک الحال اور بدنصیبی اس کا مقدّر بن گیا۔تفرقے نے اژدھا بن کر کئی کروڑ مسلمانوں کو نگل لیا۔۔۔۔۔کائناتی کنبے کے سربراہ کا ارشاد ہے:۔

''اور اللہ کی رسّی کو متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔۔۔۔۔۔''(سورۃ آلِ عمران:۱۵۳)

روشنیوں کا شہر کراچی غریب پرور اور دوست نواز بستی ہے۔ یہاں پر ہر مذہب ہر مسلک اور ہر مکتبہء فکر کے لوگ رہتے ہیں کچھ ایسے ہیں کہ گھڑیال کی بازگشت پر بے سکون مادی دنیا میں سکون تلاش کرتے ہیں۔ ایسے بھی لوگ ہیں ناقوس کی صدا پر اپنے من مندر میں من کی روشن دنیا کا کھوج لگاتے ہیں۔ کچھ لوگ ابدی آگ کے اندر سونے کے رنگ کے سنہری کپڑے سنار کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے سرنگوں ہونا سعادت ابدی سمجھتے ہیں۔

کہیں اللہ اللہ کرتے رات گزرتی ہے کہ یہی واحد راستہ نزولِ رحمت کا ہے۔ کوئی تسلیم و رضا میں لذت تلاش کرتا ہے کوئی نفس کشی کو انسانیت کی معراج سمجھ رہا ہے۔ کوئی دوزخ کے خوف میں سراسیمہ ہے۔ کوئی جنت کی خواہش میں مست و بے خود ہے۔ کوئی رحمدل ہے۔ کوئی ستم آشنا ہے۔ کوئی نفرت کرتا ہے۔ کوئی محبت کے سمندر میں خود بھی غرق ہے اور دوسروں کو بھی اس محبت کے سمندر کی موجوں کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔

غرض ایک کروڑ دس لاکھ کا کراچی شہر ایک چھوٹی کائنات ہے جس میں چاند ستارے، سورج، آسمان، زمین سب کچھ ہے۔ ایک رات کراچی کے ایک گوشے سرجانی ٹاؤن مراقبہ ہال کے کھلے میدان میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے مجھے خیال آیا۔ کیا انسانوں کی بستی کے لیے قتل و غارت گری امرِ لازم ہے؟

خیالات کے بگولے میں گرفتار گم سم جہاں بیٹھا تھا وہاں چاروں طرف جنگل ہے۔ جنگل میں کانٹوں بھری جھاڑیاں زہریلے پودے تھوہر اور زقوم اونچے نیچے ٹیلوں پر سیاہ کیکر کے زمیں بوس درخت ہیں۔ حدِ نظر تک کوئی شجر سایہ دار نہیں ہے، پانی عنقا ہے، بجلی ناپید ہے۔ سیم زدہ زمین کی کوکھ بانجھ لگتی ہے اور ضروریات زندگی کا حصول ایک مشکل مرحلہ ہے۔ جگہ جگہ گہرے گڑھے ہیں۔ کتوں، بلیوں، چوہوں، گوہ، موٹے موٹے سانپ اور مردہ خور پرندے، گدھوں کا راج ہے۔ مچھروں کے لشکر اپنی کرخت لیکن سریلی آواز میں راگ الاپتے ہوئے جب مغرب سے مشرق کی طرف کوچ کرتے ہیں تو ہر سامنے آنے والی چیز اُنکے عتاب کا شکار بن جاتی ہے اور جسم پر ددوڑے پڑ جاتے ہیں۔ دھوپ کی تمازت سے کھال جھلس جاتی ہے۔ حدت سے دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ مٹی اڑتی ہے تو آدمی کے اوپر بھوت کا گماں ہونے لگتا ہے۔

خدا کے بندوں میں سے ایک بندہ جو دنیا کے جھمیلوں سے کچھ وقفے کے لیے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ مادی دنیا اور مادہ پرست دنیا داروں سے دوری کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بندہ پر ہجوم، پر رونق اور منور شہر کراچی سے اُٹھ کر اس بے آب و گیاہ میدان میں جا ٹھہرا۔ بانسری پر محبت کے نغمے الاپنے لگا تو ایسا لگا کہ زمین میں سے ایک شیریں چشمہ ابل پڑا ہے۔ ایک دو پھر چار چھ اور دس بارہ ہم مشرب بندے اس بندہ کے ہم نشین ہو گئے۔ محبت و خلوص سے محروم ان لوگوں نے ہاتھوں میں کدال اور بیلچے سنبھال لیے۔ زمین نے مزاحمت کی اور پھر جیسے ہی اس زمین نے خود سپردگی کا شیوہ اختیار کیا۔ یہ بیمار زمین صحت مند ہونے لگی۔ جب زمین کی شریانوں میں پانی خون بن کر دوڑا تو زمین کھل کھلا اٹھی۔ کلیاں چٹکنے لگیں۔ پھول کھل اُٹھے۔ پھولوں نے اودے، پیلے، نیلے اور سرخ پیراہن پہن کر زمین کو زینت بخش دی۔ درختوں نے زمین سے سر اٹھایا۔ شاخیں ہوا کے دوش پر جھوم جھوم گئیں اور سرسبز و شاداب درخت آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ پرندوں نے درختوں پر بسیرا کیا۔ مینا نے مداح سرائی کی اور کوئل کی کوک مردہ دلوں کی زندگی بن گئی۔ صبح و شام اللہ کی تسبیح اور تقدیس بیان ہونے لگی۔ زمین پر مخملی گھاس کا دبیز قالین بچھ گیا۔ ہریالی میں سرخ رنگ کی روشیں تیار ہو

گئیں۔گلاب۔رنگ برنگ گلاب،سیاہ گلاب،سبز گلاب ہر رنگ کے گلاب۔موتیا،موگرہ،چمپا،چاندنی،چائنا روز گینداا ور نئے نئے پھولوں نے اس تپتی اور بنجر زمین کو گلزار بنادیا۔قدرت کی صناعی کا کیا تذکرہ ہو کہ چھت میں لٹکی ہوئی بڑی تعداد میں پھولوں سے بھری ہوئی بالٹیاں چاند کی چاندنی اور رات کے سناٹے میں یہ تصور قائم کرتی ہیں کہ یہ جگہ روحوں کا مسکن ہے اور بالٹی نما پھولوں کی ان قندیلوں میں روحیں محوِاستراحت ہیں۔جب یہ پھولوں بھری بالٹیاں ہوا کے دوش پر ہلتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ازلی سعید روحیں جھول رہی ہیں۔اس مرغزار احاطے میں اللہ کی ایک معصوم مخلوق کبوتر بھی آباد ہیں۔کبوتر جب جھوم جھوم کر گھوم کر غٹر غوں کر کے اللہ کو یاد کرتے ہیں بلاشبہ فضا نورانی لہروں سے لطیف ہو جاتی ہے۔جی ہاں سبز مخملی گھاس ؟ سرخ رنگ روشنیوں اور گلاب کے ٹخنوں کے بیچوں بیچ ایک جھونپڑی ہے جو سرخ ، نیلے رنگ سے آراستہ ہے۔مخمور اور مست الست لوگوں نے اس کا نام آستانہ رکھ دیا ہے۔آستانے کے صدر دروازے کے سامنے پھولوں کا ایک لہلہاتا باغ ہے۔پیچھے رات کی رانی،دن کا راجہ اس لئے لگائے گئے ہیں کہ جالیوں سے مہک آتی ہے۔آستانے کے صدر دروازے پر سونڈھ اٹھائے ایک ہاتھی سلامی دے رہا ہے اور ایک مور پر پھیلائے رقص کناں ہے صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر سیدھی جانب والتین یعنی انجیر کا قد آور درخت رکوع میں جھکا ہوا کہہ رہا ہے،پاک اور عظیم ہے میرا رب۔

اس مقدس جگہ نور الٰہی اور نور نبوت کے ترانے گائے جاتے ہیں۔حکمت و تفہیم کے اسباق ہوتے ہیں ارواح کی تشنگی بجھانے والے شعوری دنیا سے نکل کر لاشعوری دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔اس آستانے میں جو بیٹھ جاتا ہے اس کے اوپر سرور و کیف کی دنیا کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

یہی خطہ جہاں سانپوں،چوہوں،گِدھوں اور کتوں کا بسیرا تھا،جب جنت نظیر بن گیا۔چاند کی روپہلی روچاندنی میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب ایک سال کے قلیل وقفے میں کیسے بن گیا۔یاالٰہی زمین پر جنت کیسے اتر آئی۔ذہن پر خیالات کا ہجوم تھا کہ سمندر سے بادل اٹھے،بارش کا سماں بندھا اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔مجھے یک بیک فطرت کی قربت کا احساس ہوا۔پھوار جب بارش بن کر سیمنٹ کی چادروں پر ٹپ ٹپ گری تو ساز بج اٹھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا،لان میں گھاس،پودوں اور پھولوں پر بارش سے دُھلنے کے بعد نکھار،زمین کی بھینی بھینی خوشبو اور بوندوں کی ٹپ ٹپ کی آواز میں "محبت" کا احساس اُجاگر ہوا۔اور میں اس روح افزا ماحول میں اس طرح سانس لینے لگا کہ میرے اندر کی رنگین دنیا روشن ہو گئی۔میں نے دیکھا کہ جس طرح پودوں،پھولوں،بیلوں اور درختوں کو دیکھ کر میں خوش ہوتا ہوں،پھول بھی میری قربت کے طلبگار ہیں۔پودے بھی مجھے سلام کرتے ہیں اور درخت بھی مجھ سے ہم کلام ہونا چاہتے ہیں۔مجھے ہر برگ و بار سے دوستی کی خوشبو آنے لگی اور میرے اندر ایک آواز ایکو (ECHO) ہوئی۔

"میری ہستی انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔کوئی میرے لیے اجنبی نہیں ہے میں آدم زاد برادری کا ایک ایسا فرد ہوں جس کی آغوش ہر آدم زاد کے لیے کھلی ہوئی ہے۔۔"

فرد کی انا کا خول ٹوٹا اور اجتماعی شعور پیدا ہوا تو۔اُٹھتے بیٹھتے شام سویرے مجھے خدا کے حضور کا احساس ہوا،اور اس احساس نے کامل اطمینان و سکون فراہم کر دیا۔مجھے اور میرے قریب رہنے والے دوستوں کو یقین حاصل ہو گیا کہ خدا انسانی برادری کا سرپرست ہے۔خاندان کا بڑا اور نگراں ہے۔ وہ پوری نوع کا محافظ اور نگہباں ہے۔

سکون کا گہوارہ سرور و کیف کا منبع،ارضی جنت مراقبہ ہال میں گزشتہ رات میری زندگی کی مسرور ترین رات تھی۔میری روح کبھی اس سے پہلے اتنی طویل مدت اللہ کے نور سے لذت اندوز نہیں ہوئی۔اس رات میں نے،صوتِ سرمدی کو سنا۔لافانی محبت کا پیغام ملا پیغام یہ ہے کہ پوری انسان

برادری میری اولاد ہے۔ یہ سنا تو میرے اندر اولاد کے قرب اور پیار کی لہریں موجزن ہوگئیں۔ میرے دل پر آسمانی محبت کی شعاعیں عکس ریز ہوئیں۔ آسمانی محبت کا ایک امڈتا ہوا سیلاب تھا جس پر میری روح تیر رہی تھی۔ آسمانی محبت کی ہر لہر ایک آدم زاد کے روپ میں سرگوشی میں مصروف تھی۔

ہر لہر دوسری لہر سے کہہ رہی تھی کہ ہم سب کا پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے۔ وہی بھگوان ہے۔ وہی گاڈ (GOD) ہے۔ وہی یزداں ہے اور وہی ایل اور ایلیا ہے۔ خالق چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق آپس میں محبت کے ساتھ رہے۔ ایک دوسرے کے حقوق پامال نہ کرے۔ خود بھی خوش رہے اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دے۔ حوّا کی ہر بیٹی ماں اور ہماری بہن ہے۔ آدم کا ہر بیٹا ہمارا باپ اور بھائی ہے۔

پھر ہم سب نے مل کر آسمان کی بلندیوں سے اس پار دیکھا اور خالق کائنات سے عہد کیا کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں گے۔ عدم تحفظ کے احساس کو دفن کر کے ایک نئے ولولے اور جوش سے کراچی شہر، سندھ کی دھرتی اور پاکستان کی مانگ میں افشاں بھریں گے۔ انسانیت سوز عمل قتل و غارت گری سے اجتناب کریں گے۔ اور یقیناً یہ شہر پھر غریب پرور شہر اور امن کا گہوارہ بن جائے گا۔

اے لوگو سنو۔ کائنات میں تعمیری اور تخریبی دو طاقتیں کام کر رہی ہیں۔

تخریب کا سرپرست اعلیٰ ابلیس ہے جس کا مشن نوع انسانی کو ناخوش کرنا، اختلاف پیدا کرنا، بھائی کو بھائی سے لڑانا اور نسلی تعصب کے زہر سے آدم زاد کو ہلاک کرنا ہے۔

تعمیر کا سرپرست اللہ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ مخلوق ایک کنبے کی طرح رہے۔ آپس میں پیار و محبت سے رہے۔ اللہ کے دستر خوان سے ہر طرح کی نعمت خوب سیر ہو کر کھائے۔ لیکن خدا کی خدائی میں فساد برپا نہ ہو۔ اللہ خالق ہے اور خالق مخلوق سے مطالبہ کرتا ہے کہ مخلوق متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے۔

جھک جاؤ اللہ کے سامنے وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا۔ وہی ہے جس نے آسمان کو تمہارے لیے بغیر کسی ستون کے چھت بنایا۔ وہی ہے جس نے سورج نکالا کہ تمہاری کھیتیاں پک جائیں۔ وہی ہے جس نے چاند بنایا کہ تمہارے پھلوں میں شیرینی آ جائے۔ وہی ہے جس نے تمہارے لیے ہوا پیدا کی۔ اور وہی ہے جس کی زمین پر تم اپنے گھر بناتے ہو۔ اور وہ تم سے زمین کی کوئی قیمت بھی طلب نہیں کرتا۔ ان سب عنایات کے بدلے میں اللہ تم سے چاہتا ہے کہ۔ تم خوش رہو۔ بھائی بھائی بن کر رہو۔ اور اللہ کی زمین کو اخوت و محبت اور امن کا گہوارہ بنا دو۔

آپ چند مہینے تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس عمل سے گھر میں اللہ کی رحمت بارش بن کر برسنے لگے گی۔ بے سکونی ختم ہو جائے گی۔ بزرگوں اور بچوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی بڑھے گی یوں جنریشن گیپ بھی ختم ہو جائے گا۔ جب سے نوع انسانی کا اللہ پر یقین کم ہوا ہے اس وقت سے ساری دنیا پریشانی میں مبتلا ہے۔ جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اطمینان قلب عطا کرتے ہیں۔

سلسلہ عظیمیہ کے بزرگوں نے تو قرآنی علوم کو جدید سائنسی فارمولوں کی طرز پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اب ہماری خواہش ہے کہ ہمارے بچے دنیا پر قرآن کے علوم کو نافذ کریں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اپنے گھروں کو قرآنی طرز فکر سے معمور روحانی اسکول بنانے کی توفیق عطا فرمائیں۔(آمین)

فرض کریں کسی محفل میں سوایسے افراد موجود ہیں جن میں دس افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ، مفکر اور سائنسدان ہیں جب کہ باقی نوے آدمی غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ تو محفل کی توجہ تعلیم یافتہ افراد کو حاصل ہو جائے گی۔ یہ دس افراد دوسروں کی بہ نسبت دنیا کے کسی بھی ملک میں باآسانی آمدورفت کر سکتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ ملک ہنسی خوشی ان کو امیگریشن دے دے گا۔ علم وفضل کی بناء پر ہر جگہ ان کو عزت و تکریم حاصل ہو گی۔

اب باقی نوے آدمیوں کو دیکھیں۔ وہ مالی اعتبار سے کتنی ہی ترقی کر لیں۔ گھر بنالیں، پیسہ اور بینک بیلنس کا ڈھیر لگادیں ان کو دس علم دوست آدمیوں پر ایسی فضیلت کبھی حاصل نہ ہو سکے گی۔ حالانکہ تعداد میں وہ نو گنا زیادہ ہیں اور ان کے پاس وسائل کی بھی کثرت ہے۔ اگر ان ۹۰ آدمیوں کو کوئی ترقی کا کام کرنا ہے تو وہ مجبور ہیں کہ ان دس آدمیوں کا تعاون حاصل کریں۔ چنانچہ جس آدمی کے پاس علم ہو گا چاہے وہ دنیاوی علم ہو یا روحانی اسے دیگر لوگوں پر برتری حاصل ہو جائے گی۔ اگر کسی کے پاس دنیاوی علم ہے تو وہ دنیاوی معاملات میں ممتاز ہے جب کہ روحانی علوم حاصل کرنے والا بندہ تمام دنیاوی علوم حاصل کرنے والے بندوں سے افضل ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انسان دنیا میں باعزت ہے۔ اسے دیگر مخلوق پر شرف اور فضیلت حاصل ہے۔ تو اس کی بنیاد صرف اور صرف علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قبل ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں تشریف لائے۔ غور فرمائیے جب سے دنیا قائم ہے۔ اربوں کھربوں کی تعداد میں لوگ پیدا ہوتے رہے۔ اپنی زندگی کے شب و روز پورے کرتے اور آخر کار انتقال کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ابتداء سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔

دنیا کی ابتداء سے اربوں کھربوں کی تعداد میں جنم لینے والے انسانوں کے مقابلے میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی تعداد انتہائی کم ہے۔ لیکن تمام پیغمبروں کو نوع انسانی کی کل تعداد پر ہمیشہ برتری حاصل رہے گی اس لئے کہ تمام پیغمبران علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم کے حامل تھے۔

پیغمبران علیہم السلام میں سے کسی پر صحائف اُترے، کسی پر کتابیں اُتریں۔ حضرت موسیٰؑ پر تورات اُتری۔ حضرت داؤدؑ پر زبور کا نزول ہوا اور حضرت عیسیٰؑ پر انجیل نازل ہوئی۔ یہ تمام صحائف اور کتب سماوی اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ پیغمبروں کو وہ علوم حاصل ہیں جو نوع انسانی کی اکثریت کو حاصل نہیں ہیں۔

سب سے آخر میں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ غارِ حرا میں مراقبہ کے دوران ایک دن جبرائیل امین ظاہر ہوئے اور کہا "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا"۔ وقت ضائع کرتے ہیں۔

آپ دیکھئے یہاں بھی علم کا ہی تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نوع انسانی پر یہ عظیم احسان ہے کہ محبوب ربُ العالمینؐ کے ذریعے یہ علم کتابی صورت میں ہمارے سامنے آ گیا۔ جس کو ہم قرآن پاک کہتے ہیں۔ جب بھی انسان کی زندگی پر غور کیا جائے گا اور اس کا شرف تلاش کیا جائے گا تو یہی بات سامنے آئے گی کہ انسان کا شرف "علم" ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی اور ابتری کی وجہ بھی یہی ہے کہ مسلمان کے اندر علم سیکھنے کا جذبہ ختم ہو گیا۔ جس طرح آج غیر مسلم اقوام میں علمی، سائنسی، معاشرتی اور معاشی ترقی ہے اور ان کے ہاں ہر روز نت نئی سائنسی ایجادات سامنے آتی رہتی ہیں اسی طرح آج سے بارہ سو سال پہلے مسلمان نئی نئی ایجادات کرتے تھے اور اسی بنیاد پر ساری دنیا پر حکمران تھے۔

جب مسلمان علم سے دور ہوتے گئے تو مغربی دنیا نے ان کے علوم کو سیکھنا شروع کیا۔ بساط اُلٹ گئی۔ مسلمان مفلوک الحال ہوتے گئے اور غیر مسلم حکمران ہوتے گئے۔ آج ہم محکوم ہیں اور غیر مسلم حاکم۔۔۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں دنیا کا وہ کونسا خطہ ہے جہاں اسلام کا پیغام نہیں پہنچا۔ جبکہ آج یہ صورتحال ہے کہ کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں مسلمان ذلیل و خوار نہیں ہو رہے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی ابتری کی جو بنیادی وجہ ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے روحانی ورثے کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جس میں دنیاوی، سائنسی، کائناتی، تخلیقی، معاشرتی، معاشی اور روحانی علوم موجود ہیں لیکن ہم نے اس میں تفکر کرنا چھوڑ دیا۔ غور و فکر کے دریچوں کو اپنے اوپر بند کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا رہے ہیں۔

ہم میں سے اکثریت حضرات رات گئے تک مسلسل ٹی وی دیکھتے ہیں۔ گھنٹوں بے مقصد موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ مختلف کھیلوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ روزانہ نہیں تو کم از کم اتوار کے دن والد صاحب اپنے ذمے ڈیوٹی نکالیں کہ اپنے بچوں اور گھر کے دیگر افراد کے ساتھ اجھائی کے طور پر ۱۵ منٹ قرآنی آیات پر تفکر کرنا ہے۔ جس آیت یا سورت پر غور و فکر کرنا ہے، اس کا پہلے مطالعہ کر لیں۔ اس تشریح یا توجیہہ پر مبنی کوئی علمی مواد میسر آ جائے تو اسے بھی پڑھ لیں۔ سائنسی اور روحانی علوم کی روشنی میں جب آپ قرآن کی تعلیم میسر آ جائے تو اسے بھی پڑھ لیں۔ سائنسی اور روحانی علوم کی روشنی میں جب آپ قرآن کی تعلیم اپنے بچوں کو دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کی اپنی زندگی کا اور پھر آپ کی آئندہ نسل کی زندگی کا رخ بدل جائے گا۔

میں نے اس سلسلے میں بہت سوچا کہ آخر کیا طریقہ اختیار کیا جائے کہ مسلمان قوم کی حالت بہتر ہو جائے۔ مسلمان قوم کو اللہ تعالیٰ دوبارہ ہی عروج عطا کر دے جو ہمارے اسلاف کو حاصل تھا۔ اور ایک بار پھر مسلمان تمام دنیا پر حکمران کی حیثیت سے ابھریں۔ بہت غور کیا تو یہی بات سامنے آئی کہ اس ابتری اور زوال سے نکلنے اور عروج حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن سے جو اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اسے ہم دوبارہ استوار کر لیں۔ ہماری بقا و سلامتی اور عروج کتابِ حکمت میں محفوظ ہے۔

میں نے ایک مرتبہ سروے کروایا تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں بیس گھروں میں سے صرف دو گھروں کے بچے قرآن پڑھے ہوئے تھے۔ جب یہ صورت ہو جائے گی تو قرآن سے یقین اٹھ جائے گا اور بحیثیت مجموعی مسلمان بھی قرآن سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

میں اپنے بزرگوں، ماؤں، بہنوں، بھائیوں، دوستوں اور بچوں سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے گھر کو قرآنی فکر سے آراستہ کریں۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔۔ آپ خود بھی قرآن پر تفکر کریں اور اپنے بچوں کو بھی قرآن میں تفکر کی ترغیب دیں بچے کیوں کر اُس میں دلچسپی لیں گے۔ ہر گھر میں اگر ایک ماں اپنے بچوں کو دس منٹ کے لئے لے کر بیٹھ جائے، قرآن کا ایک رکوع پڑھے اور اس کا ترجمہ پڑھے، ترجمے پر خود بھی تفکر کرے اور اپنے اس تفکر میں بچوں کو بھی شامل کرے۔ آپ کے بچے قرآن کا ترجمہ بہت غور سے سنتے ہیں اور قرآن میں موجود پیغمبران علیہم السلام کے قصوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو گھروں کے کسی بڑے بچے کی یہ ڈیوٹی لگادی جائے کہ۔۔ بیٹا تم قرآن پاک کی تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ بیان کرو اور اس پر تفکر کرو۔

قرآن کو مشکل ہرگز نہ سمجھیں کہ "جناب، ہم کوئی مولوی تو ہیں نہیں۔ ہم اسے کیسے سمجھیں ایسی بات ہر گز نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ہم نے قرآن کا سمجھنا آسان کر دیا، ہے کوئی سمجھنے والا۔ (سورہ القمٰن: ۱۷)

ایک مجلس میں مختلف طرز فکر اور کئی علوم کے ماہرین جمع تھے۔ حسن اتفاق سے ایک فقیر نے صدا لگائی حق ہُو، ہُو اللہ دانشوروں نے فقیر کی صدا سنی تو عزت و تکریم کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا۔ صورتحال کچھ یوں بنی۔

ایک صاحب علم الاعداد کے ماہر تھے۔ دوسرے صاحب علم نجوم پر دسترس رکھتے تھے۔ تیسرے صاحب کو علم جفر پر عبور حاصل تھا۔ چوتھے بزرگ ایک بہت بڑی درسگاہ میں سائنسی علوم کے استاد تھے۔ سلام و دعا کے بعد ان چار دانشوروں نے گہری آنکھوں سے فقیر کو ٹٹولا۔ ماہر علم نجوم نے کہا۔ ستارے انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں انسانی زندگی کو سعید اور نحس بناتے ہیں۔ کوئی آدمی جب ساڑھ ستی میں آجاتا ہے تو اس کے اوپر پریشانیوں تکلیفوں بیماریوں اور بے سکونی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

فقیر بولا! علم نجوم میں بنیادی بات ٹائم فیکٹر ہے۔ پیدائش کے وقت عام طور سے وقت نوٹ نہیں کیا جاتا۔ محض یہ معلوم ہوتا کہ بچہ صبح کے وقت پیدا ہوا یا شام کے وقت پیدا ہوا۔ وقت کا تعین نہیں کرتے۔ کائناتی نظام میں ہر چیز ہر وقت ہر آن حرکت میں ہے، ستارے بھی حرکت میں ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب علم نجوم کی نفی کرتا ہے۔ آسمانی کتابیں بیان کرتی ہیں کہ انسانوں کے لئے چاند کو، سورج کو، ستاروں کو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا گیا ہے۔

ماہرین علم نجوم یہ کہتے ہیں کہ ستاروں کے زیر اثر انسانی زندگی میں تبدیلی ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ستارہ انسان کے لئے مسخر نہیں ہے بلکہ انسان ستارے کے تابع ہے۔

علم الاعداد اور علم جفر کے ماہرین یہ تشریح سن کر دم بخود ہو گئے اور بولے۔ علم نجوم کے بارے میں ایسی تشریح نہ کہیں پڑھی اور نہ کہیں سنی ہے۔

سائنسدان نے ہاتھ کی ہتھیلی سے تین بار پیشانی کو تھپکا اور اپنی خشخشی داڑھی کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے کہا:

سائنسی علوم میں کوئی بات (logic) کے بغیر نہیں ہوتی جبکہ فقراء سائنسی علوم سے بے بہرہ ہوتے ہیں یا سائنسی علوم کو اہمیت نہیں دیتے، فقیر نے یہ بات سنی تو اس کا دوران خون تیز ہو گیا۔ کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں۔ لگتا تھا آنکھوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ فقیر نے دھیمے لیکن چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ سائنسدانوں کا ایک گروہ خدا کے وجود کو بغیر (logic) کے ماننے پر تیار نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کائناتی مشینری کو چلانے والی انرجی کو الیکٹران کا نام دیتا ہے اس گروہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ الیکٹران کو کسی نے نہیں دیکھا اور نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کیسی منطق ہے کہ سائنسدان خدا کے وجود کو لوجک کے بغیر تسلیم نہیں کرتا اور ساتھ ہی کائنات کی بنیاد ان دیکھی چیز کو قرار دیتا ہے۔ یہ منافقانہ طرز عمل کم از کم پڑھے لکھے لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ مجلس میں لوگ نہایت انہماک اور توجہ سے دانشوروں کی ان عالمانہ نکتہ آفرینیوں میں منہمک تھے کہ مجلس میں ایک مولوی صاحب تشریف لے آئے، چہرے پر طویل و عریض داڑھی تھی سر پر عمامہ تھا، آنکھوں میں سرمے یا کاجل کے ڈورے تھے، سفید براق لباس زیب تن تھا، کلف لگا ہوا ململ کا کرتا اور ٹخنوں سے اونچے پاجامے میں حضرت مولانا بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ مجلس میں داخل ہوئے تو ان کی شخصیت کا رعب پڑا اور حاضرین مجلس میں کھڑے ہو گئے، لوگوں نے جھکی ہوئی گردنوں سے مصافحہ کیا اور ان میں سے کچھ نے عقیدت و احترام کے جذبے سے مغلوب ہو کر معانقہ کیا، حضرت مولانا کی تشریف آوری کے بعد مجلس کا رنگ ہی بدل گیا۔ بات سائنسی دائرے سے نکل کر مذہب اور تصوف پر آ گئی۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ صوفیا نے اسلام میں تصوف کی پیوند کاری کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر بلند مرتبہ کوئی ذات ہے تو وہ صحابہ

کرام رضی اللہ تعالی عنہاہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں تصوف کی اصطلاحات اور تصوف کی مشقیں ریاضت و مجاہدات اور مراقبات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ لوگ اپنے روحانی استاد یا مرشد کی کرامات بیان کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کی کرامات کا تذکرہ کہیں نہیں ہوتا۔

فقیر نے کچھ دیر خلا میں اس طرح دیکھا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو، لوگ خوش ہوئے کہ مولوی صاحب کے علم کا جادو فقیر پر چل گیا ہے۔ روشنی کا ایک جھماکہ ہوا، فقیر کے چہرے پر ملکوتی تبسم پھیل گیا، آنکھوں میں سچے موتیوں جیسی چمک ظاہر ہوئی، ایک عجیب خمار اور سرشاری کی کیفیت میں آواز گونجی لگتا تھا کہ آواز خلا کے اس پار سے کہیں سے آرہی ہے۔ آواز یہ تھی۔۔ میں نے اعلیٰ علیین میں صحابہ کرام اور صحابیات کی ارواح طیبات کو دیکھا ہے ان کی روحیں نور نبوت ﷺ سے لبریز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اور صحابیات کی توجہ زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق غور و فکر میں صرف ہوتی تھی اور ان کی روحانی تشنگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر اور آپ کی احادیث پر توجہ کرنے سے پوری ہو جاتی تھی۔ صحابہ کرام اور صحابیات کو مرتبہء احسان حاصل تھا مرتبہ احسان یہ ہے کہ بندہ یہ محسوس کرے اور دیکھے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے اور مرتبہ احسان یہ ہے کہ بندہ محسوس کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہی طرز عمل تصوف اور روحانیت ہے۔ مرتبہ احسان دراصل ذہنی یکسوئی، تفکر کنسنٹریشن مراقبہ یا Meditation ہے. اب رہ گئی بات کرامات کی، تاریخ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور صحابیات کی کرامات اور خرق عادات کا ریکارڈ موجود ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے فرمایا، میں نے تمہیں بیس وسق کھجوریں ہبہ کی تھیں اس مال میں تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں شریک ہیں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا بابا جان میری تو ایک ہی بہن اسماء ہے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے جواب دیا تمہاری سوتیلی ماں بنت خارجہ رضی اللہ تعالی عنہ کے پیٹ میں لڑکی ہے یہی وہ لڑکی تھی پیدائش کے بعد جن کا نام ام کلثوم رکھا گیا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ ممبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ دوران خطبہ فرمایا: یاساریہ۔۔۔الجبل۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی آواز ہزاروں میل دور شہر نہاوند میں ساریہ رضی اللہ تعالی عنہ اور لشکر اسلام نے سنی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس ایک خاتون آئیں اور تین مرتبہ اپنے جرم کا اعتراف کرکے کہا کہ مجھے سنگسار کر دیا جائے۔ حضرت عثمان نے اس کو کھجوریں، کشمش اور آٹے کے تھیلے دے کر روانہ کر دیا، بعد میں معلوم ہوا کہ اس عورت نے مصیبتوں اور فاقوں سے تنگ آکر یہ جھوٹ بولا تا کہ اسے تکلیفوں سے نجات مل جائے۔ جناب حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ کا واقعہ خیبر جیتی جاگتی اور منہ بولتی زندہ کرامت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے جب اس دروازے کو پھینک دیا تو سات آٹھ آدمیوں نے اس دروازے کو پلٹنے کی کوشش کی لیکن پلٹ نہ سکے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ جبرائیل علیہ السلام تم کو سلام کر رہے ہیں میں نے کہا ان پر اللہ کی سلامتی، رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ حضرت بی بی فاطمہ نے خوب اچھی طرح غسل کر کے نئے کپڑے پہنے اور گھر کے صحن میں بستر پر لیٹ گئیں۔ قبلے کی طرف منہ کر کے اپنا ایک ہاتھ رخسار مبارک کے نیچے رکھا اور کہا میں اپنے اللہ سے ملنے جارہی ہوں اور بالکل پاک ہوں۔ اب کوئی شخص بلا ضرورت مجھے نہ کھولے اس کے بعد ان کی روح پرواز کر گئی۔ صحابہ کرام اور صحابیات کی بے شمار کرامات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

صدر محترم معززاراکین انجمن اور سامعین کرام!
السلام وعلیکم

میرے مقالے کاموضوع ہے "قرآن پاک میں قصص الانبیاءاور اللہ تعالی کے بیان کردہ ان قصوں میں حکمت اور روحانی علوم۔۔۔۔"

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس میں کوئی سورت، کوئی آیت، کوئی نقطہ مفہوم و معنی سے خالی نہیں ہے۔اللہ تعالی نے قرآن پاک میں انبیائے کرامؑ کے جو قصے بیان کیے ہیں وہ کوئی کہانی بیان نہیں کی ہے کہ کہانی سنا کر اللہ ہمیں مرعوب کرے۔اللہ تعالی کو ہمیں مرعوب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری حیثیت اور حقیقت ہی کیا ہے۔۔۔اللہ کے علوم لا متناہی ہیں۔اللہ کا منشا یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر خود بھی قدم بڑھائیں اور اللہ کی نعمتوں کے معمور خزانوں سے فائدہ اٹھائیں۔قرآن پاک میں انبیاءؑ سے متعلق جتنے بھی واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں ہمارے لیے اور بنی نوع انسانی کے لیے ہدایت اور روشنی ہے۔آج کی نشست میں ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت سلیمانؑ کے واقعات میں روحانی نقطہ نظر سے اللہ تعالی کی حکمت بیان کریں گے۔

حضرت موسیٰؑ اپنے اہل وعیال سمیت بکریاں چراتے چراتے جب مدین سے بہت دور نکل گئے تو سردی کافی بڑھ گئی۔ سردی کی شدت اور اس سے بچاؤ کے لیے انہیں آگ کی ضرورت پیش آئی۔رات کے وقت جس جگہ قیام تھا وہاں سامنے کوہ سینہ کا سلسلہ نظر آرہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے چقماق استعمال کیا مگر سخت سردی کی بناء پر چقماق سے چنگاری نمودار نہیں ہوئی۔وادی ایمن کی طرف نظر اٹھی تو حضرت موسیٰؑ کو چمکتا ہوا شعلہ نظر آیا بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو میں آگ لے آؤں۔

وادی ایمن میں پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت پر روشنی ہے۔ مگر یہ روشنی نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ بجھتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جیسے جیسے آگے بڑھے یہ روشنی ان سے دور ہوتی چلی گئی۔یہ دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا اور انہوں نے ارادہ کیا کہ واپس چلے جائیں۔جوں ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑے آگ قریب آگئی ۔ حضرت موسی رک گئے آواز آئی " اے موسی! میں ہوں ، میں اللہ رب العالمین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پس موسی اس کے قریب آئے تو پکارے گئے۔"اے موسی! میں ہوں تیرا پروردگار، اپنے جوتے اتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے اور دیکھ میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے، پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سن!"

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال

کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

آواز کو سنا اور ان کو معلوم ہوا کہ ان کے نصیب میں وہ دولت آگئی ہے جو انسانی شرف کا طرہ امتیاز ہے تو والہانہ فریفتگی میں محو حیرت کھڑے رہ گئے۔

پھر پوچھا گیا "اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟"

موسیٰ نے کہا" یہ میری لاٹھی ہے۔اس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے اپنی دوسری ضروریات بھی پوری کرتا ہوں "۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا" موسیٰ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دے۔"

موسیٰ نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا۔ پس ناگاہ وہ اژدھا بن کر دوڑنے لگا۔ موسیٰ گھبرا گئے۔ پیٹھ موڑ کر چلے ہی تھے کہ آواز آئی:

موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ ہم اس کو اصلی حالت پر لوٹا دیں گے۔"

موسیٰ نے بے خوف ہو کر اژدھے کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا اور فوراً ہی وہ اژدھا لاٹھی بن گیا۔اب موسیٰ کو دوبارہ پکارا گیا:

"اپنے ہاتھ کو گریبان میں لے جا کر بغل سے مس کر اور باہر نکال، تیرا ہاتھ روشن ہو جائے گا۔" اور فرمایا" یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے۔وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔"

حضرت موسیٰ نے عرض کیا" میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زور بیان رکھتا ہے۔اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہوا

"ہم تیرے بھائی کی اعانت سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے  اور تم دونوں کو ایسی سطوت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیاں تمہارے پاس ہیں۔ تم اور تمہارے پیروکار فرعون اور اس کی جماعت پر غالب رہیں گے۔"

حضرت موسیٰ منصب نبوت سے سرفراز، کلام ربانی سے فیضیاب، تبلیغ کی دعوت میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پا کر مقدس وادی سے اترے اور اپنی بیوی کو لے کر مصر روانہ ہو گئے۔ مصر پہنچے تو حضرت ہارون ؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب رسالت عطا ہو چکا تھا۔

حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون ؑ نے باہم مشورت سے طے کیا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم فرعون کو سنانا چاہیے۔ غرض دونوں بھائی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بے خوف و خطر اندر داخل ہوئے۔ فرعون کے تخت کے قریب پہنچ کر حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون ؑ نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور فرمایا۔"

"اے فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے، ہم تجھ سے دو باتیں چاہتے ہیں۔ پہلی یہ کہ خدا پر یقین لے آ اور کسی کو اس کا شریک نہ بنا۔ اور دوسری یہ کہ ظلم سے باز آ جا۔ اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے۔ خدا نے ہمیں دو زبردست نشانیاں عطا فرمائی ہیں۔ "

فرعون نے جب یہ سنا تو کہا۔" موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور اسی گھر میں بچپن گزارا۔ اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا" یہ صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ مجھ سے نادانستگی میں ایک شخص قتل ہو گیا لیکن کیا یہ عدل وانصاف کا تقاضہ ہے کہ مجھے ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدلہ یہ قرار پائے کہ تو بنی اسرائیل کی تمام قوم کو غلام بنائے رکھے؟"

فرعون نے اپنی شیطنت سے بھری سرشت کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر خدا ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی تحقیر کی اور ان سے بحث شروع کر دی۔ ان کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی مگر حضرت موسیٰؑ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے فرمایا" تو نے جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہیں لیکن کیا یہ باتیں اس بات کا جواز پیدا کرتی ہیں کہ تو پورے بنی اسرائیل کو غلام بنا لے۔"

حضرت موسیٰؑ نے جب خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دی اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز اٹھائی اور فرمایا إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ تو فرعون نے کہا" موسیٰ! تو یہ نئی بات کیا سناتا ہے، کیا میرے علاوہ بھی کوئی رب ہے جس کو تو رب العالمین کہتا ہے؟ اور درباریوں کی طرف مخاطب ہو کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" کیا تم سنتے ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود کو پیغمبر اور رسول کہتا ہے اور پھر حضرت موسیٰؑ سے مخاطب ہو کر کہا" اگر تو نے میرے سواء کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے ضرور قید کر دوں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا" اگر میں تجھے اپنے رب کی نشانیاں دکھادوں تب بھی تو مجھ کو قید کرے گا؟"

فرعون نے کہا۔" اگر تو سچا ہے تو مجھے نشانیاں دکھا۔"

حضرت موسیٰؑ آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا۔ اسی وقت اس نے اژدھے کی شکل اختیار کر لی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈال کر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم کے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو وہ جھنجھلا کر کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ ایک بڑا ماہر جادوگر ہے اور اس نے یہ سب ڈھونگ اس لیے رچایا ہے کہ تم پر غالب آکر تم کو تمہاری سرزمین مصر سے باہر نکال دے۔ ہم کو سوچنا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر فرعون اور اس کے درباریوں کے باہمی مشوروں سے یہ طے پایا کہ مملکت مصر کے تمام ماہر جادوگروں کو دارلسلطنت میں جمع کیا جائے تاکہ وہ حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کریں۔ اس فیصلے کے بعد فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ۔" موسیٰ ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ تو ہم کو سرزمین مصر سے بیدخل کرنا چاہتا ہے لہذا اب تیرے اور ہمارے درمیان مقابلے کے دن کا معاہدہ ہونا چاہیے۔

## حق و باطل کا معرکہ

یوم جشن آپہنچا میدان میں فرعون تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ تخت نشین ہے لاکھوں کا مجمع ہے۔ ایک جانب مملکت مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے سحر کے لوازمات کے ساتھ کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول، حق کے پیغمبر، سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰؑ اور

حضرت ہارونؑ کھڑے ہیں۔ فرعون بہت مسرور اور شاداں ہے۔ اسے یقین ہے ساحرین ان دونوں بھائیوں کو شکست دے دیں گے۔ وہ ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ انعام واکرام کا لالچ دے رہا ہے۔ ساحرین کو بھی اپنی کامیابی کا یقین ہے اور انعام کے حصول کے تصور سے نہایت مسرور اور خوش ہیں۔

حضرت موسیٰؑ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو مجمعے پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے۔ تم کیا کر رہے ہو۔ ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ۔ ڈرے ہے خدا تم کو اس بہتان تراشی کی سزا میں نیست و نابود نہ کر دے کیونکہ جس کسی نے خدا پر بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا۔"

جادوگر آگے بڑھ کر حضرت موسیٰؑ سے کہتے ہیں"موسیٰ! ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ابتدا تیری طرف سے ہوگی یا ہم پہل کریں؟"

حضرت موسیٰ نے فرمایا"پہل تمہاری طرف سے ہوگی اور تم اپنے کمال فن کی پوری پوری حسرت نکال لو۔"چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں، بان اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان میں حرکت پیدا ہوئی اور سانپ اور اژدھے کی شکل اختیار کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ پورا میدان ان سے بھر گیا۔

حضرت موسیٰ نے جب یہ حال دیکھا تو ان کو تردد ہوا۔ فوراً! وحی نازل ہوئی"موسیٰ! خوف نہ کھاؤ۔ ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہوگے۔ اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دو۔"

حضرت موسیٰؑ نے جونہی لاٹھی کو زمین پر ڈالا وہ ایک بڑا اژدھا بن گئی اور اس نے ساحروں کے تمام شعبدوں یعنی ان گنت سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا اور میدان صاف ہو گیا۔

## حکمت

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کوئی تذکرہ ایسا نہیں کیا جو محض کہانی یا تاریخ ہو جو کچھ ارشاد کیا ہے اس کے پس پردہ نوع انسانی کے لیے ایک حکمت ہے۔ مثلاً فرعون کے زمانہ میں مصر کے رہنے والے بنی اسرائیل کی عورتوں سے، مردوں سے اور بچوں سے خدمتیں لیتے تھے لیکن ان کے رہنے کے لیے ایسی جگہ مقرر کی تھی جہاں کوڑیاں پڑتی تھیں۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ انہیں روٹی تک میسر نہ تھی۔ کپڑا پھٹا پرانا انہی مصریوں سے مل جاتا تھا انہیں اس بات کی بھی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے شہر میں داخل ہو سکیں بجز ان اوقات کے جس میں وہ مصریوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایک طرف بنی اسرائیل کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف مصریوں کی شان و شوکت کا یہ حال تھا کہ آج تک لوگوں کے پیش نظر ہے۔ ان کے وہ کمالات، ان کا وہ فن اور ان کے جادوگروں کی عظمت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ آج بھی ان کی یادگاریں اور ان کے جادو کے اثرات فراعین کے مقابر سے نمایاں ہیں۔

جو تختیاں قبطی زبان میں لکھی ہوئی ملی ہیں ان کو پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرعون اور اس کی اولاد نے اپنے مقبرون کو بنانے میں ایسا فن استعمال کیا جو کمال کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ انہوں نے تختیوں پر لکھ دیا تھا"اگر ہماری کوئی چیز خراب کی گئی یا کسی نے ہاتھ لگایا یا کوئی سامان چرایا تو تباہ و برباد ہو

جائے گا۔اس قسم کے حالات پیش آتے رہے ہیں کہ جس زمانہ میں بھی مقبروں کو کھولا گیااس کام میں پیش پیش لوگ اوران کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے ۔آج بھی ان کے فن اوران کے جادو میں اثر موجود ہے اوران کی لکھی ہوئی تحریر کے مطابق عمل درآمد ہوتا ہے۔

اندازہ لگائیے کہ ایک طرف غربت زدہ اور اچھوت قوم اور دوسری طرف فرعون اوراس کا جاہ و جلال اور وہ جادوگر جو پیغمبر کے مقابلے میں آ گئے۔

بظاہر اگر کسی شخص کو بنی اسرائیل اور فرعون کے حالات بتائے جائیں تو وہ کیسے یقین کرے گا کہ بنی اسرائیل کے لوگ فاتح ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف ان کو سربلند کیااور دوسری طرف فرعون کو قعرِ مذلت میں پھینک دیا۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ لوگ اس کو محض کہانی یا تاریخ سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر غور کریں جو نوع انسانی کے لیے راہ ہدایت ہے۔ فراعین کے زمانہ کے علوم اور کمالات آج بھی لوگوں کے سامنے ہیں۔ یہ علوم انہیں کہاں سے ملے ؟ ظاہر ہے کہ یہ علوم بھی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوئے اللہ کا کرم دیکھیے کہ اس نے ہماری زمین پر ایسے آدمی بنائے جنہوں نے اس قسم کے کمرے وضع کیے جس میں ممی (mummy) رکھی گئی اور وہ ممی آج تک ویسی کی ویسی موجود ہے۔ایسے زبردست علوم وفنون کے ماہر اور شان وشوکت کے حامل لوگوں کو بنی اسرائیل جیسے خستہ حال لوگوں نے ملیامیٹ کر دیا۔

فراعین مصر کے مقبروں کا ایک کمال یہ ہے کہ کسی ایک مقبرے میں جتنے کمرے ہیں وہ نہ چوکور ہیں اور نہ گول بلکہ ایک خاص وضع کی ایجاد ہیں۔ وہ کمرے جو ممی کی حفاظت کرتے ہیں انہی آدمیوں کے بنائے ہوئے ہیں جن کو اللہ نے تخلیق کیا۔اور علم سے نوازا۔اس علم کے ذریعہ انہوں نے مقبرے تعمیر کیے۔آپ ایک طرف ان کے حال پر اللہ کا کرم دیکھیے اور دوسری طرف اس قوم کی سرکشی ملاحظہ کیجئے جس کو ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی فرعونیت کہا جاتا ہے۔ غور طلب یہ ہے کہ ان کی نگاہوں پر اس ہی عقل نے جس پر مصریوں کا تکیہ تھااور جس عقل سے مصر کو سربلندی اور تہذیب حاصل تھی وہی عقل ان کے لئے گمراہی کا سبب بن گئی اور نتیجہ میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔یہ ناراضگی ان کے اوپر عذاب در عذاب بن کر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قوم کے ذریعہ عذاب میں مبتلا کر دیا جو خستہ حال، کوڑیوں پر رہنے والی، ننگی، بھوکی اور اچھوت قوم تھی۔۔۔۔۔۔ایسی قوم جس کا نہ کوئی معیار زندگی تھا، نہ اس کے پاس کوئی طاقت تھی اور نہ ہی وہ مصریوں کی طرح علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔

بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو پیدا کر دیا اس اوراس شخص نے مصریوں کا تختہ الٹ دیا۔یہ بھی فکر طلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پرورش بھی فرعون کے گھر میں پائی۔اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیااوران کے دماغوں کو بیکار کر دیااوراس بات کو چھپالیا کہ یہ بچہ بنی اسرائیل کا ہے۔اہل فن، ذہین اور یکتائے روزگار ساحروں کی نگاہوں سے بھی وہ بچہ پوشیدہ رہا۔یہ دوسرا پردہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہوں پر ڈال دیا۔

کیا آج وہ اللہ ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے ؟ یا وہ اللہ بدل گیا ہے ؟ یا وہ اللہ پردہ کے اندر نہیں دیکھتا یا آج کوئی انسان ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے پردوں میں جھانک سکے ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو لوگوں کی نظر سے چھپادیتا ہے وہی چیزیں سرکش لوگوں کے لئے عذاب بن جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔آج کا دور بھی علوم وفنون اور عقل کا دور ہے اور یہ علوم وفنون اور عقل انسان کے لئے ایک آزمائش اور ابتلا بن گئی ہے جیسا کہ مصریوں کے لئے ان کے علم وفنون اور عقل عذاب بن گئی تھی۔آج کے دن علم وفنون اور عقل کا

تذکرہ عام ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل جس میں اللہ کے ساتھ تفکر شامل نہ ہو اور روحانی قدریں نہ ہوں وہ انسانوں کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اللہ تعالی نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ یعنی مہر لگادی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

یہ تذکرہ ان لوگوں کا ہے جو ہدایت سے محروم ہیں یعنی جن کے دل شکوک وشبہات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جو علوم وفنون اور عقل پر تکیہ کرتے ہیں۔ ایسی عقل جس کو یہ پتا نہیں کہ ایک لمحہ کے بعد ہمارے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اللہ تعالی کے قانون کے مطابق ہدایت یافتہ وہ لوگ ہیں جن کا یقین غیب پر قائم ہے۔ اور جو قائم کرتے ہیں صلوۃ اور اللہ تعالی کی طرف سے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں قرآن پاک پر اور ان کتابوں پر جو قرآن سے پہلے نازل ہوئیں اور یوم آخرت پر۔

سائنس کی ترقی کے اس دور میں طرز فکر کے لیے دو اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ ایک کا نام فکر جدید اور دوسری کا نام فکر قدیم رکھا گیا۔ فکر جدید سے مراد یہ ہے کہ وہ باتیں جو عقل وشعور کے احاطہ میں آسکیں اور جو علوم، عقل وشعور کے دائرے میں نہیں آتے اور جن کے رموز ونکات واضح نہیں ہوتے اس طرز کا نام فکر قدیم ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ علم حصولی کے ذریعہ جو فہم پیدا ہوئی اس کا نام فکر جدید رکھا گیا اور وہ فہم وادراک جو اس علم حصولی کے دائرہ کار سے باہر ہے یعنی ایسی بات جو عقل کے دائرہ میں نہ آئے وہ فکر قدیم قرار پائی۔ ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے علوم وفنون کو چھوڑ کر جدید دور کے علمائے فن کے رموز ونکات کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ فکر جدید کی نت نئی ترقیوں نے ہم مسلمانوں کو بھی اس ہی عقل کی دلدل میں لا پھینکا ہے جس میں فراعین مصر کے علماء گرفتار بلا تھے۔ آج کے لاسکی دور میں فاصلے مٹ گئے، آواز ہزاروں میل کو محیط ہو گئی اور اس کی علمی توجیہہ بھی ہمارے سامنے آئی وہ یہ کہ آواز کہ قطر بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں جن کو ویو لینگتھ (WAVE LENGTH) کا نام دیا گیا۔

سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ ۴۰۰ قطر سے نیچے اور ۱۲۰۰ قطر سے اوپر کی آوازیں آدمی نہیں سن سکتا لیکن یہ آوازیں برقی رو کے ذریعہ سننا ممکن ہے۔ ہم جب اپنے اسلاف کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ یہ آوازیں برقی رو یا آلۂ سماعت کے بغیر بھی سنی جا سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ مدینہ منورہ میں خطبہ دے رہے تھے۔ دوران خطبہ بلند آواز میں فرمایا **يَا سَارِيَه اَلْجَبَل** ۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی یہ آواز مصر میں سنی گئی اور حضرت ساریہ رضی اللہ تعالی عنہا نے اس آواز کا پورا پورا مفہوم سمجھ کر عمل کیا۔ اللہ تعالی کے ارشاد کے مطابق زمان ومکان (TIME AND SPACE) کی نفی کی مثال حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں بھی مذکور ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"میں چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت شاہی دربار میں موجود ہو۔ تم میں سے کون اس خدمت کو انجام دے سکتا ہے"۔

عفریت نے جو قوم جنات میں سے تھا کہا۔ "اس سے پہلے کہ آپ دربار برخاست کریں میں یہ تخت لا سکتا ہوں۔" جن کا یہ دعویٰ سن کر ایک انسان جس کے پاس کتاب کا علم تھا یوں گویا ہوا "اس سے پہلے کہ آپ کی پلک جھپکے میں یہ تخت آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے رخ پھیر کے دیکھا تو ملکہ سبا کا تخت موجود تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یمن سے بیت المقدس کا فاصلہ تقریبا ۱۵۰۰ میل ہے اور یہ فاصلہ پلک جھپکتے طے ہو گیا۔ محض خیالی بات نہیں بلکہ ایک مرصع اور منقش تخت شاہی بغیر کسی وسیلہ کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو گیا۔

یہ وہ فکر ہے جس کا نام فکر قدیم رکھا گیا۔ فکر جدید نے ہمیں اس سے دور بہت دور دور کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ میں یہ بات فکر طلب ہے اور اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ زمان و مکان کی نفی کا یہ عمل ایک ایسے انسان سے سرزد ہوا جس کے پاس علم کتاب تھا۔ یعنی وہ کتاب کے علوم اور رموز سے باخبر تھا۔ دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہر وہ علم موجود ہے جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے یا آئندہ کبھی تذکرہ ہو گا۔ اللہ جل شانہ، نے فرمایا ہے۔ ہم نے داؤد اور سلیمان کو ایک علم دیا۔ یعنی یہ علم اللہ تعالی کی طرف سے(INSPIRE) ہوا۔ (INSPIRATION) خواہ سن کر ہو خواہ کوئی منظر دیکھ کر ہو، بہر حال وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ کے پیغمبروں کے پاس وحی آتی ہے اور وحی کے ذریعہ نزول علم ہوتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ جب اللہ کی طرف سے کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو وہ اللہ ہی کا علم ہوتا ہے کسی انسان کا علم نہیں ہوتا جیسا کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے جہاز، ٹیلی فون فیکس جن لوگوں نے بنائے وہ اللہ ہی کی طرف سے (INSPIRE) کیے گئے، وہ کیا تھے۔ وہ کیا ہیں اس سے ہمیں بحث نہیں. ہم صرف اللہ کی ذات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں اور اللہ قادر مطلق ہے۔ دوسری بات یہ کہ انسان کو وہی چیز مل جاتی ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے لیکن شرط قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ تن، من، دھن سے کسی چیز کی تلاش میں لگ جائے۔ اور تلاش کو زندگی کا مقصد قرار دے۔ یہ اللہ کی سنت ہے۔ پہلے بھی جاری تھی۔ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔

اس بات کو ہمارے بزرگوں نے دو الفاظ میں بیان کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جوئندہ یابندہ۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ "اور نازل کیا ہم نے لوہا اور اس میں انسانوں کے لیے بے شمار فوائد رکھ دیے ہیں"۔ (سورۃ الحدید: ۲۵) سائنس کی کونسی ایسی ایجاد ہے جس میں کسی نہ کسی طریقہ سے لوہا استعمال نہ ہوتا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ کتاب ہماری ہے فائدہ غیر اٹھا رہے ہیں۔ ہم نے اللہ تعالی کے ارشاد کی قدر نہیں کی اور تفکر کو زندگی کا مقصد قرار نہیں دیا۔ نتیجہ میں ہم اللہ تعالی کے اس انعام سے محروم ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔ قانون اپنی جگہ قانون ہے۔۔۔۔۔۔ لوہے میں بے شمار فوائد موجود ہیں۔ جس نے ان فوائد کو تلاش کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کی اس نے ان فوائد کو حاصل کر لیا۔

چند اشخاص نے زمین کے اندر اس دھات کو تلاش کیا جس کو یورینیم (URANIUM) کہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جب جوئندگان کو یورینیم مل گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اور ان کو قابل تعریف سمجھ کر ان کی پیروی کی جو کامیاب تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم قرآن پاک کی طرز فکر کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا یہ بات ہم نہیں جانتے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کے ایک ایک حرف پر یقین رکھتا ہو، ایسا یقین جو شکوک و شبہات سے پاک ہو۔ اگر ہم اپنے دل میں ایمان اور یقین کو جگہ دیں اور دل کی حدود تک لے جائیں اور دل کے احاطہ میں رکھیں اور اللہ تعالی کے ارشادات پر پورا یقین کر لیں تو ہمارے اوپر وہ تمام رموز قرآن پاک میں موجود ہیں

منکشف ہو سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس کی دعوت دی ہے، جگہ جگہ فرمایا ہے "فکر کرو"۔ یہ بھی فرمایا ہے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے، تم ایمان نہیں لائے، مسلمان ہو لیکن ابھی تمہارے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا"۔

دیکھیے!۔۔۔۔۔۔۔۔یہاں مسلمان اور مومن کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔ مسلمان ہونا الگ بات ہے اور دل میں ایمان کا داخل ہونا الگ بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہم مسلمان ہیں لیکن ابھی ہمارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا جس وقت ہمارے دلوں میں ایمان داخل ہو جائے گا یقیناً ہم تسخیر کائنات کے فارمولوں سے واقف ہو جائیں گے۔ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ہم ہر معاملہ میں یورپ کی تقلید کرتے ہیں اس لیے کہ ان کے علوم پر ہمیں اعتماد اور یقین ہے لیکن قرآن کریم کے بتائے ہوئے فارمولوں پر ہمیں یقین نہیں ہے۔ قرآن پاک میں جو فارمولے تسخیر کائنات سے متعلق بیان ہوئے ہیں ان کی تشریح کرنا اس مختصر وقت میں ممکن نہیں لیکن میں آپ کی توجہ ایک بار پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ اس واقعہ میں یہ بات ہمارے سامنے آئیں کہ جو بندہ ۱۵۰۰ میل کے فاصلہ سے پلک جھپکنے سے پہلے ملکہ سبا کا تخت لے آیا اس بندہ نے پہلے کہا کہ میرے پاس علمِ کتاب ہے۔ علمِ کتاب کو حاصل کرنا تفکر کے ذریعہ ممکن ہے۔ تفکر کا اصل اصول معلوم کرنے کے لیے اپنی روح سے وقوف ضروری ہے۔ جو لوگ اپنی روحانی صلاحیتوں سے واقفیت نہیں رکھتے ان کا یقین کمزور ہوتا ہے اور ان کا شمار ہدایت یافتہ لوگوں میں نہیں ہوتا اور جو لوگ ہدایت یافتہ نہیں ہیں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی جاتی ہے اور آنکھوں پر پردے ڈال دیے جاتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے روحانی صلاحیتوں سے واقف ہونے کے لیے اسباق تجویز فرمائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روح کی صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مراقبہ ضروری ہے۔ مراقبہ کا قانون بیان کرتے ہوئے اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ سماوات اور ارض کی روشنی ہیں اور ارض پر موجود تخلیق روشنی کے ہالا میں بند ہے اور یہ روشنی روح ہے اور روح کے علم کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تصوف میں اس کا اصطلاحی نام لطائف ستہ ہے۔

(۱) لطیفۂ اخفیٰ (۲) لطیفۂ خفی (۳) لطیفۂ سری (۴) لطیفۂ روحی (۵) لطیفۂ قلبی (۶) لطیفۂ نفسی

زندگی کے تار و پود پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ زندگی کے تقاضے اور زندگی میں کام آنے والے اعمال و اشغال اور تحریکات سب کا سب علم ہے۔۔۔۔۔۔۔ہم زندہ ہیں یہ بھی علم ہے۔ بھوک، پیاس اور زندگی کے سارے تقاضے علم سے باہر کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ زندگی سے متعلق اس علم کو مظہر بننے تک چھ دائروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب کوئی علم مظہر بنتا ہے تو پہلے اس کا ایک واہمہ ہمارے دماغ میں وارد ہوتا ہے۔ جہاں یہ وارد ہوتا ہے اس کا نام لطیفہ اخفیٰ ہے۔ پھر یہ واہمہ خیال بنتا ہے۔ جہاں پر خیال بنتا ہے اس کا نام لطیفہ خفی ہے۔ خیال کے اندر جب روشنی کا ہجوم ہوتا ہے تو یہ تصور بن جاتا ہے اور اس کا مقام لطیفہ سری ہے۔ تصور جب احساس کے خد و خال میں ڈھلتا ہے تو اس کا نام لطیفہ روحی ہے اور جب یہ احساس لطیفہ قلبی پر وارد ہوتا ہے تو نگاہ بن جاتا ہے۔ نگاہ مشاہدہ بن کر عمل بن جاتی ہے۔ یہی لطیفہ نفسی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی فرد واحد بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک انسان کی زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہ راست خیالات اور تصورات سے قائم ہے۔ کوئی خیال انتہائی کربناک ہوتا ہے اور کوئی خیال ہمارے لئے مسرت آگیں ہوتا ہے۔ ڈر، خوف، شک، حسد، طمع، نفرت و حقارت، غرور و تکبر، خود نمائی وغیرہ وغیرہ خیالات کی پیداوار ہیں اور محبت، ایثار، یقین انکساری اور حزن و ملال کا نہ ہونا بھی خیالات کی کارفرمائی ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہ خیال بجلی کی طرح کوند جاتا ہے کہ ہمارے یا ہماری اولاد کے ساتھ حادثہ نہ پیش آجائے۔ جیسے ہی خیال کی یہ رو دماغ سے ٹکراتی ہے آدمی اپنے اندر حادثات سے

متعلق پوری پریشانیاں کڑی در کڑی محسوس کرنے لگتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہی حال خوشی اور خوشحال زندگی کا ہے۔ جب انسانی تصورات ایسے نقطہ پر مرکوز ہو جاتے ہیں جن میں شادمانی اور خوشحالی کی تصویریں موجود ہوں، انسان خوش ہو جاتا ہے۔

خیالات میں اگر بے یقینی، شک اور وسوسوں کی بھرمار ہوتی ہے تو اس کے اندر روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں اور تصورات الجھن۔ اضطراب اور پریشانی کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ ان کی افراط آدمی کو روح سے دور کر دیتی ہے اور روح سے دوری واقع ہونے پر آدمی کے اندر آدمی ایک متعفن پھوڑا بن جاتا ہے۔ اور جب یہ پھوڑا پھوٹ جاتا ہے تو اس کی سڑاند پھیلنے لگتی ہے۔ اللہ ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ جب یہ صورت واقع ہو جاتی ہے تو یہ آدمی اس گروہ میں شامل ہو جاتا ہے جس گروہ کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ مہر لگادی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ڈال دیا پردہ ان کی آنکھوں پر اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

کتاب "لوح و قلم" مصنفہ حضرت باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ میں درج ہے کہ انسان چھ لطیفوں سے مرکب ہے۔ اور ہر دو لطیفوں سے ایک دائرہ بنتا ہے۔ یعنی انسان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا دارو مدار ان تین دائروں پر ہے۔ پہلے دائرے میں اللہ تعالی کی مشیت اور تسخیر کائنات کے فارمولے نقش ہیں۔ دوسرے دائرے میں حیات بعد الممات کی تشریح ہے اور تیسرا دائرہ ان اعمال و حرکات کی تشریح کرتا ہے جن سے زندگی سرگرم عمل ہے۔ روح کے دائرے کی وضاحت کرتے ہوئے حضور قلندر باباولیاء رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ انسان پر ایک زمانہ میں ایک وقت تھا جب وہ ناقابل تذکرہ شے تھا۔ ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے تخلیق کیا تا کہ اس کا امتحان لیں اور اسے سماعت و بصارت دی۔ ہم نے اسے راستہ دکھادیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔ (سورۃ الدھر: ۱-۳)

رُوح کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قرآن حکیم میں اس کی وضاحت موجود ہے:

"تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ رُوح کیا ہے، تو کہہ دے رُوح میرے رب کے امر سے ہے"۔

امر کے بارے میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے "ہو جا" اور وہ "فیکُون" ہو جاتی ہے"۔ (سورۃ یٰسین: ۸۲)

قرآن کریم کی ان آیات میں تفکر کیا جائے تو یوں کہا جائے گا:

انسان ناقابل تذکرہ شے تھا۔ اس کے اندر روح ڈال دی گئی تو زندگی دوڑنے لگی اور رُوح امر رب ہے اور امر رب یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کُن اور فیکُون ہو کر مظہر بن جاتی ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں اس بات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

انسان روح ہے۔ روح امر رب ہے اور امر رب اللہ تعالی کا ارادہ ہے اور یہ ارادہ وجہ تخلیق کائنات ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ انسان اللہ تعالی کے فرمانے کے مطابق اللہ تعالی کی روح ہے لیکن بظاہر کتنا مجبور ولاچار ہے۔ مجبور ولاچار ہونے کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کے ہم علم کتاب سے ناواقف ہیں۔ یہی ناواقفیت وہ متعفن پھوڑا ہے جس نے ہمیں تسخیر کائنات کے فارمولوں سے محروم کر دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم قرآن پاک میں تفکر کر کے اس گم کردہ راہ کو تلاش کریں اور اللہ تعالی کے انعامات واکرام سے فیض یاب ہو کر سرفرازی اور سربلندی حاصل کریں۔

اللہ تعالی ہم سب کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین یا رب العالمین !

ماں۔۔۔۔۔ہماری زمین ہے جب ہمیں کسی چیز کی ضرورت پیش آتی ہے، ہماری ماں زمین ہمارے لیے اپنی گود کھول دیتی ہے اور ہمیں اپنی آغوش میں لیکر زندگی سے متعلق تمام وسائل فراہم کرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ تمام وسائل اور جو کچھ آج زمین کے اوپر اور زمین کے اندر نظر آرہا ہے وہ دو گیسوں کا مرکب ہے، یعنی گیس کے دو بادل ہیں جو ہر آن ہر لمحہ زمین کے اوپر اور زمین کے اندر موجود اشیاء کی آب یاری کر رہے ہیں۔ یہ دو بادل ہائیڈروجن اور ہیلیئیم ہیں۔۔۔۔۔۔ہائیڈروجن اور ہیلیئیم کے ملاپ سے موجودات عالم کا ظہور ہوتا رہا، اور ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظیم سائنسدان اللہ نے ان گیسوں کے انسانی شماریات سے زیادہ ذرّے پیدا کیئے ہیں اور کوئی ذرّہ مقررہ جسامت اور معیّنہ مقدار سے الگ نہیں ہے۔ہائیڈروجن کے ہر ذرّے میں ایک مرکزی مغز ہوتا ہے جس میں مثبت برقی رو پائی جاتی ہے اور اس کے گرد منفی برق کا ایک ناقابل تذکرہ چھوٹا سا ذرّہ تیزی سے گھومتا رہتا ہے جس کے گھومنے کی رفتار تقریباً ایک لاکھ چھیاسی ہزار تین سو دو بیالیس میل فی سیکنڈ ہے۔اس ننھے ننھے ذرّے کا نام برقیہ (ELECTRON) ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ہیلیئم کے ذرّہ کا مرکزی مغز ہائیڈروجن کے ذرّے کے مرکزی مغز سے چار گنا ہے۔اس کے مغز کے گرد دو برقیے روشنی کی تیز رفتاری سے چکر کاٹ رہے ہیں۔اس حساب سے، ہیلیئم کا ذرّہ ہائیڈروجن کے ذرّہ سے چار گنا بھاری ہے۔ مگر ہیلیئم کے الیکٹرون میں اتنی ہی منفی برقی رَو ہے جتنی ہائیڈروجن کے الیکٹرون میں ہے۔۔۔۔۔۔۔عظیم سائنسدان اللہ نے ان دو گیسوں کے ذرّے پیدا کر کے خود مختاری دیکر انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ جہاں چاہے اُڑتے رہیں اور جس سے چاہے ملتے رہیں۔۔۔۔

عظیم سائنسدان اللہ نے ایک ضابطہ، ایک قاعدہ، ایک فارمولا بنا دیا ہے، جب ہیلیئم کے ذرّے ہائیڈروجن کے ذرّوں سے ملیں گے اور معیّنہ نسبت سے ملیں گے تو فلاں رنگ بنیں گے اور رنگوں کی آمیزش سے رنگوں کی ترتیب و تدوین سے فلاں چیز پیدا ہو گی۔۔۔۔۔۔ہم بہت کوتاہ نظر ہیں لیکن۔ عظیم سائنسدان اللہ نے ہمیں کوتاہ نظر نہیں بنایا۔۔۔۔۔۔۔ہم جب کوتاہ نظری سے منہ موڑ کر بصیرت سے کام لیتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زمین پر ہی نہیں پوری کائنات میں، خلا میں، آسمانوں میں، عرش میں، بیت المعمور میں، سدرۃ المنتہیٰ کے اس طرف اور سدرۃ المنتہیٰ کے اُس طرف کوئی چیز بے رنگ نظر نہیں آتی۔ یہ رنگ رنگ دنیا، یہ رنگ رنگ کائنات ایک قانون کے تحت ہمہ وقت سفر کر رہی ہے۔

ہم کشش ثقل پر غور کرتے ہیں تو ہماری اندر کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ کسی ذرّے کے اندرونی اور مثبت و منفی برقیے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔۔۔۔۔ہر ذرّہ ایک انا ہے اور ہر انا ایک لہر ہے اور ہر لہر ایک رنگ ہے۔جب انا، انا سے۔ لہر لہر سے اور رنگ، رنگ سے گلے ملتے ہیں تو نئی جان بنتی ہے۔ سورج زمین سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے اور زمین سورج کے اوپر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ڈورے ڈال رہی ہے۔ ہم جب انسانی ساخت اور اسکے اندر نصب مشینری کو دیکھتے ہیں تو یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ جسم ذرّوں کے اتصال سے قائم ہے اور ہر ذرّہ دوسرے ذرّے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ذرّوں کے اتصال اور جسم کی دُوری کی مناسبت سے کشش قائم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

ہمارے جسم میں گیسیں جلتی اور حرارت پیدا کرتی ہیں جس سے جسم کی مشینری مسلسل حرکت میں ہے جسم انسانی کی مشینری کا ایک پرزہ پھیپھڑا ہے۔ان پھیپھڑوں میں ستّر کروڑ خلیات ہیں۔ خون کے اندر جو خلیات سرگرم عمل اور سرگرم سفر ہیں، ان سب کو زنجیر کی طرح ایک ساتھ ملا

دیا جائے تو عظیم سائنسدان اللہ کی ایک تخلیق سائنسدان کے حساب سے دو لاکھ میل لمبی قطار کے برابر ہے۔۔۔۔۔۔۔ جسم انسانی میں ایک بنیادی پرزہ قلب ہے۔ یہ ایک آٹومیٹک پمپ ہے، جو خون کے خلیات اور آکسیجن کو پیچ در پیچ وریدوں، شریانوں (نالیوں) میں سے گزار کر جسم کے سارے حصوں تک پہنچاتا ہے۔۔۔۔

یابدیع العجائب! انسانی جسم میں ایک عجیب پرزہ اور ہے جو خود بخود اندرونی آگ کو ایک ہی اندازہ پر جلائے رکھتا ہے۔ یہ سارا نظام صحیح، منظم اور اعلیٰ تربیت کے ساتھ جاری ہے۔۔۔۔۔ عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق انسان نے جب چاروں شعوروں میں سے ایک شعور سے گزر کر دوسرے شعور (لاشعور) میں قدم رکھا تو بات کچھ اسکی سمجھ میں آنے لگی۔ یہ سوچ، یہ تفکر، اس گروہ نے کیا ہے جو خود کو آخری نبیؐ کی امّت نہیں کہتا اور جو قرآن پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ اسکی حرماں نصیبی ہے کہ ہمارے دانشور، واعظ، گدّی نشین محراب و مسجد کے مکین، تکوینِ عالم کے راز کو سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کیا ہمارے پاس دماغ نہیں ہے، کیا ہمارے پاس بصیرت نہیں ہے؟ آخر ہم اپنی اندر کی آنکھ کو کب تک اندھا رہنے دیں گے؟ آخر ہم اپنے لاشعور سے کب واقف ہوں گے؟۔۔۔۔۔۔۔۔ عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ ہمیں متوجہ کرنے کے لیئے، ہمیں عزت و قار دینے کے لئے اور ہمیں اپنی سائنس میں شریک کرنے کے لئے ہمارے نبیؐ کے اوپر نازل کردہ سائنسی فارمولوں کی کتاب قرآن میں کہتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے آسمان کیسا رفیع الشان بنایا۔ اسے کیسی اچھی اچھی قندیلوں سے منوّر کیا۔ زمین کیسی خوبصورتی سے بچھائی۔ زمین کے اوپر کیسے کیسے خوبصورت درخت اگائے، ہلکے، شوخ رنگ، ملائم، معطر پھول کھلائے۔ پہاڑوں کو میخیں بنا کر زمین میں گاڑ دیا۔ کیسے کیسے پہاڑ بنائے، سنگلاخ چٹانیں اور خوبصورت دلہن کی طرح سجی ہوئی پہاڑیاں، نغمے الاپتی ہوئی آبشاریں، مدھم موسیقی گنگناتی ہوئی یخ بستہ ہوائیں، بے قرار دلوں پر مرہم کا کام کرنے والے برف کے تودے اور جسمانی صحت کے لئے کیسی کیسی بوٹیاں اگائیں!۔۔۔۔۔۔۔ آج کا سائنس دان جانتا ہے کہ مثبت اور منفی برقی رو آپس میں ملے اور ایک دوسرے کو بے اثر کیئے بغیر چین نہیں لیتی۔ لیکن عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ نے اپنے ذاتی علم سے ایک ایسا نظام قائم کر دیا ہے کہ منفی اور مثبت برقی رو ایک دوسرے میں جذب نہیں ہوتی، ورنہ کائناتِ عالم میں ہر جگہ فساد برپا ہو جاتا اور کوئی چیز اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہتی۔۔۔۔۔۔۔۔ میں تقریباً گڑ ور افراد کی اپنی قوم کے دانشوروں، واعظوں، سجّادہ نشینوں اور علماء سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ:۔

"قرآن کو صرف عذاب و ثواب کی کتاب بنا کر طاق میں سجا کر نہ رکھوائیں۔ عوام سے کہیں کہ اس کے اندر تسخیر کائنات کے فارمولوں پر غور کریں۔۔۔۔۔۔۔ خدارا! اپنی معصوم، بھولی بھالی لیکن ذہین قوم کی سوچ اتنی بلند کر دیں کہ۔۔۔۔ ہم عظیم سائنسدان اللہ کی عظیم سائنسدان مخلوق بن کر اعلیٰ مقام حاصل کر لیں۔

اب سے اربوں، کھربوں اور سنکھوں سال پہلے ایک عظیم المرتبت سائنسدان کو خیال آیا کہ میں ایسی ایجادات تشکیل دوں کہ جس سے میں جانا جاؤں، حرکت و برکت کا ایک ایسا فعال نظام ترتیب دوں، جس نظام میں نظام ہائے ترتیب و تدوین جمع ہوں اور ہر نظام ایک مکمل کہکشانی نظام ہو اور کہکشانی نظاموں میں بے شمار الگ الگ نظام قائم ہوں اور ان نظاموں میں سے ہر نظام ایک دلکش دنیا ہو۔

عظیم سائنسدان کا ذہن جب اس طرف متوجہ ہوا تو اس نے اپنی سائنسی اختراعات و ایجادات کا سلسلہ اس طرح قائم کر دیا:۔

- ایک کتاب المبین
- ایک کتاب المبین میں تیس کروڑ لوح محفوظ
- ایک لوح محفوظ اسی ہزار حضیرے
- *ایک حضیرے میں ایک کھرب سے زیادہ مستقل آباد نظام اور بارہ کھرب غیر مستقل نظام
- *ایک نظام کسی ایک سورج کا دائرہ وسعت ہوتا ہے۔ ہر سورج (STAR) کے گرد نو۹، بارہ ۱۲، یا تیرہ ۱۳ سیارے گردش کرتے ہیں۔

یہ محض قیاس آرائی ہے کہ انسانوں کی آبادی صرف زمین (ہمارے نظام شمسی) میں پائی جاتی ہے۔ انسانوں اور جنات کی آبادیاں ہر حضیرے پر موجود ہیں۔ ہر آبادی میں زندگی کی طرزیں اسی طرح قائم ہیں جس طرح زمین پر موجود ہیں۔ بھوک، پیاس، خواب، بیداری، محبت، غصہ، جنس، افزائش نسل وغیرہ وغیرہ زندگی کا ہر تقاضہ، ہر جذبہ، ہر طرز ہر سیارہ میں جاری و ساری ہے۔

ایک حضیرے پر ایک کھرب سے زیادہ آباد نظام واقع ہیں ایک آباد نظام کو قائم رکھنے کے لئے غیر مستقل نظام اسٹور کی حیثیت رکھتے ہیں غیر مستقل نظام سے مراد یہ ہے کہ پورے پورے نظام بنتے اور ٹوٹ جاتے ہیں اور اس ٹوٹ پھوٹ سے آباد، مستقل نظام فیڈ ہوتے رہتے ہیں۔ ہر نظام میں الگ الگ سماوات، ارض، جبال، حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ اسی طرح موجود ہیں جس طرح ہم اپنے نظام میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اس نظام کو چلانے کے لئے اور خود کو متعارف کرانے کے لئے عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک ASSISTANT بنایا اور اپنے اس نائب یا ASSISTANT کو اس نظام سے متعلق تمام فارمولے سکھا دیئے۔۔۔اس لئے اس کی حیثیت اس کائنات میں ممتاز ہو گئی۔۔۔اس ممتاز حیثیت کے فرد کو عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صناعی اور بہترین تخلیق قرار دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ عظیم سائنسدان کی بہترین صناعی اور تخلیق کی خود فریبی، سرکشی اور حکم عدولی نے اس کو اپنے منصب سے دور کر کے نیچے بہت نیچے گہرائی اور اسفل سافلین میں پھینک دیا۔ ہم جب عظیم سائنسدان اللہ کی کائنات میں تفکر کرتے ہیں تو ہمیں کائنات کی بنیادی اور بڑی حقیقت اور عظیم سائنسدان کا سب سے بڑا شاہکار آدم نظر آتا ہے۔ آدم گو کہ اپنے جسم اور وجود کے اعتبار سے بہت بڑا نہیں ہے مگر اس کی ساخت اور ساخت میں فارمولوں پر بنی ہوئی مشین ایسی مشین ہے جس مشین کا ہر کل پرزہ اور جس مشین کی ہر حرکت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا وقفہ ایک سائنس ہے۔۔۔عظیم سائنسدان اللہ کا شاہکار انسان عجیب و غریب اور وسیع و عریض کائنات کا

جوہر ہے۔ ہم جب کائنات کے جوہر، اس انسان کی مشینری کے کل پرزوں اور ان کل پرزوں کو حرکت دینے والی انرجی کو متحرک کرنے والی لائف اسٹریم(LIFE STREAM)پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے عجائبات کاایک عالم آجاتا ہے۔۔۔۔۔

انسانوں میں سے چند انسانوں نے اس دماغ سے اور اس عقل و شعور سے جب کام لیا(جو دماغ اور عقل و شعور عظیم سائنسدان کی ایجاد ہے تو ایسے ایسے عجائبات سامنے آئے کہ جن عجائبات کو دیکھ کر، پڑھ کر، سمجھ کر آدم زاد کو اپنی حقیقت کا سُراغ مل جاتا ہے۔ کائنات کے جوہر انسان نے جب اپنے اندر فٹ آٹو میٹک مشین یا کمپیوٹر سے کام لیااور خود کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تو نئے نئے علوم اور نئے نئے فلسفے وجود میں آتے رہے۔ان ہی علوم میں ایک علم، جسمانی ساخت "علم الابدان" ہے۔۔۔۔۔

اس علم کو پڑھنے سے پورا تو نہیں مگر کسی قدر، عظیم سائنسدان اللہ کی عظمت و جبروت اور قدرت کاانکشاف ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مرد کے مادہء تولید کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں ڈھائی کروڑ حیواناتِ منویہ ہوتے ہیں اور عام حالات میں ایک اخراج میں کئی مکعب سینٹی میٹر مادہ خارج ہوتا ہوتا ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق اس مادہ میں پچاس کروڑ زندگیاں موجود ہوتی ہیں۔ ان آدھے ارب جرثوموں میں ہر ایک جرثومہ اپنے اندر ایک جیتا جاگتااور متحرک انسان بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایک اوسط قد و قامت انسانی جسم جن چھوٹے چھوٹے خلیات سے بنتا ہے، ان کی تعداد ایک کروڑ ارب ہے، یہ خلیات روزانہ بنتے ہیں اور ختم ہوتے ہیں اور پھر ان کی جگہ دوسرے نئے خلیات لے لیتے ہیں۔ ہر سیکنڈ میں خون کے دس لاکھ سُرخ خلیات ختم ہو جاتے ہیں اور اتنی ہی تعداد میں نئے خلیات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان خلیوں میں اپنا ایک پورا نظام حیات ہے، جسے عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ سائنسدان، انسانوں نے پچھلے پچیس سال میں ڈھونڈ نکالا ہے اور جس کے نتیجہ میں جنیات کی ایک پوری سائنس سامنے آگئی ہے۔ یہی جین بچے میں منتقل ہوتے ہیں تو وہ کالا یا گورا ہوتا ہے۔۔۔ دادا، نانا، پر نانااور ماں باپ کے انہی جین کی وجہ سے بچے کی آنکھیں نیلی، بھوری یا سیاہ ہوتی ہیں اور یہی وہ جین ہیں جن کی وجہ سے بچے کے بال کالے، بھورے یا سنہری ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

انسانی جسم کے جملہ عجائبات کا بیان تو ناممکن ہے۔ آیئے چند حقائق پر نظر ڈالیں:۔

انسانی دماغ میں چھیاسی ارب سے زیادہ نیورون ہوتے ہیں۔۔۔ ایک آدمی کی اوسط زندگی میں دل تین لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے اور خون کو دوڑانے کے لئے دل اپنی بجلی بھی خود پیدا کرتا ہے۔۔۔ اگر ایک آدمی ستر سال زندہ رہے تو اس کا دل 2.5 ارب دفعہ دھڑکتا ہے۔ ایک آدمی کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے پچاس کروڑ مرتبہ پھُولتے اور سکڑتے ہیں۔۔۔ انسانی آنکھ میں ایک کھرب سے زیادہ روشنی قبول کرنے والے ریشے ہوتے ہیں۔۔۔ انسانی بدن میں خون کی شریانوں کو اگر ناپا جائے تو ان کی لمبائی ساٹھ ہزار سے ایک لاکھ میل لمبی ریلوے لائن کے برابر ہوتی ہے۔

انسانی جسم کے اندر جتنے بڑے بڑے پُرزے فٹ ہیں، وہ سب خود کار جنریٹر ہیں۔ اور ہر جنریٹر اپنا نظام چلانے کے لئے خود کفیل ہے۔ یہ کیسی حیران کن اور عجیب بات ہے کہ ایک بچہ بچپن سے نکل کر لڑکپن اور جوانی کی حدود کو پھلانگتا ہوا بڑھاپے میں داخل ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر نصب شدہ مشینری بغیر کسی تار برقی نظام کے چلتی رہتی ہے۔ عظیم سائنسدان اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "انسان میری بہترین تخلیق ہے مگر وہ اسفل سافلین میں پڑا ہوا ہے۔"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مذاہب کی تاریخ کے اوراق پلٹنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مذہب کا ابتدائی دور باقی مذہب کے نظریات اور طرز فکر کا حامل رہا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا رہا مذہبی قدریں کم ہوتی رہیں اور بالآخر یہ تلاش کرنا ممکن نہیں رہا کہ اصل مذہب کیا ہے اور اگر مذہب لوگوں کی زندگی سے متصادم ہے تو پھر مذہب کی ضرورت کیوں ہے۔ ایسا ہی دور جب یونانی معاشرہ میں داخل ہوا تو مغربی ایشیا میں ایک نئی طرز فکر اور ایک نئے فلسفے کی تخم ریزی ہوئی ایک شخص آرفیس سامنے آیا۔ یہ واقعہ چھٹی یا ساتویں قبل مسیح کا ہے۔ مورخین کہتے ہیں۔ کہ اس دور میں مغربی ایشیا میں دینی اور فکری دور شروع ہوا۔ اس فکری دور میں صوفیانہ تصورات واعمال نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ تصوف کے تصورات کے رجحانات زیادہ تر سامی افکار اور زرتشی عقائد کا نتیجہ تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہب کے اجارہ داروں نے لوگوں کو انسانی اقدار سے بدگمان کر دیا تھا جبکہ لوگوں کو سکون کی تلاش تھی سکون کی جگہ بدگمانی اور عدم تحفظ کے احساس نے جب لوگوں کو گم کردہ راہی بنا کر بے سکون اور غم آشنا بنا دیا اور مسلمہ اخلاقی اقدار کے کھوکھلے پن سے شر اور بدی کے احساس جرم کو بہت گہرا کر کے لوگوں کو بے حس کر دیا تو لوگ مذہب بیزار ہو گئے۔۔۔۔۔۔ مذہب کے مروجہ اصولوں کی بازگشت تو سنائی دیتی تھی مگر مذہب کے پیروکاروں میں عمل کا فقدان تھا۔ مذہب کی بنیاد اگر یہ تھی کہ ساری کائنات اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ اس پورے کنبے کا کفیل ہے تو فی العمل کوشش یہ تھی کہ برادری ٹوٹ جائے اور جتنا زیادہ ہو سکے انسانی برادری کو نفرتوں تعصب نسلی منافرت اور گروہوں میں بانٹ دیا جائے۔ جب نیکی کے تصورات میں کوئی اچھائی اور عملاً نیکی نظر نہ آئے اور لوگ محسوس کرنے لگیں کہ نیک اعمال جن کی مسلسل تبلیغ کی جارہی ہے اور کی جاری ہے وہ ہر قسم کی نیکی اور خوبی سے عاری ہیں۔ وہ محض ریاکار اور دکھاوے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو ان حالات میں حکیمانہ اور حساس ذہین لوگوں میں روحانی تڑپ بیدار ہو جاتی ہے۔ یہی وہ دور تھا جس میں آرفیسی نظام کی بنیاد پڑی۔۔۔۔۔۔ اس نظام کے مقاصد میں اولیت اس بات کو تھی کہ بندہ کا خالق سے رابطہ قائم ہو انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہو۔ آرفیسی نظام میں روح سے آزاد ہونے کا تصور ابھرا۔ کہا یہ گیا کہ جسمانی تقاضوں سے انسان گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اس طرح ترک حیوانات وجود میں آیا۔ انتہا یہ کہ انڈوں کے کھانے کی بھی ممانعت کر دی گئی لوگ اس نظریہ پر بڑی شدت سے متوجہ ہوئے اور جسم کو ثانویت کا درجہ مل گیا۔ مگر چوں کہ یہ عمل فطرت کے خلاف تھا اس لئے یہ نظام زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ جس طرح ہر اچھی تحریک اپنے ابتدائی دور کے کچھ اجنبی تصورات کے زیر اثر اور کچھ انسانی کمزوریوں کے باعث بلندی سے پستی میں گر جاتی ہے۔ اس طرح آرفیسی کا بھی حشر ہوا۔

آرفیسی نظام کے بعد افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی روح "نور ازلی" کے چند بکھرے ہوئے اجزاء ہیں جو مسافتیں طے کر کے اس زمین پر آگرے ہیں۔ موت کے بعد کی زندگی کا تصور بھی اس نظریہ میں موجود ہے۔ کہا گیا کہ مرنے کے بعد ایک انسان کی روح ایک ہزار سال تک نیکی کا اجر پاتی ہے اور اس طرح بدکردار آدمی کی روح سزا کی مستحق ہے۔ اس کے بعد وہ کسی دوسرے جسم میں نمودار ہوتی ہے اور موت و زندگی کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔

آرفیسی نظام چونکہ راہبانہ زندگی پیدا کرنا چاہتا تھا اس لیے یہ تحریک ہمہ گیر پیمانے پر کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن اس نظریے سے فیثا غورث سقراط اور افلاطون متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے افلاطون نے روح کا جو تصور پیش کیا ہے وہ آرفیسی نظریات پر مبنی ہے۔

فیثاغورث نے کوشش کی کہ آرفیسی نظام میں تبدیلیاں کی جائیں تاکہ اس نظام کی خرابیاں دور ہو جائیں۔ فیثا غورث کا خیال تھا کہ اخلاقی قدروں کے قیام کے لیے ظاہری اعمال ورسوم کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اہمیت نیت کی ہے۔ اگر کوئی شخص دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے قربانیاں

دیتا ہے سفید اجلے کپڑے پہنتا ہے ہر معاملہ میں دعا کرتا ہے۔اور اس کے ساتھ عمل نہ ہو تو اس عمل سے اس کی اخلاقی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی بے روح اعمال اس کے کام نہیں آئیں گے۔

فیثا غورث ۵۸۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔اس نے اپنے زمانے کے تمام متمدن ملکوں کا دورہ کیا وہاں رائج مذہبی اقدار ور سوم رواج سے استفادہ کیا اس نے کوشش کی کہ تمام افکار ایک جگہ جمع ہو جائیں اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا نتیجہ میں مشرقی اور مغربی حکمت کے خزانے ایک ہی جگہ مرکوز ہو گئے۔

افلاطون اور ارسطو نے فیثا غورث کی تعریف کی ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں کے لئے الگ مذہب کی بنیاد رکھی اور اس نے محاسبہ کے عمل کو بہت زیادہ اہمیت دی۔اس کے پیروکار اس سے شدید محبت وعقیدت رکھتے تھے۔جو روایات فیثا غورث اور اس کے قدیم پیروں کے متعلق ہمیں ملتی ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تاکید کی تھی کہ بات کم سے کم کی جائے تاکہ بے ہودہ اور غلط باتوں سے محفوظ رہیں۔شادی نہ کی جائے یا کم سے کم کثرت مباشرت سے پرہیز کیا جائے۔

تین صدیوں کے بعد حالات نے کروٹ بدلی ارسطو اور افلاطون کے پیروکاروں نے علیحدہ علیحدہ اپنے حلقے قائم کر لئے۔اور اس کے بعد رواتی اور ان کے مخالف گروہ اپی غورث کے حامیوں نے بھی اپنے اپنے حلقے بنا لیے۔۔۔۔۔۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یونان کی سرزمین سے فلسفہ اٹھ کر اسکندریہ میں آ گیا۔جہاں فیثا غورث کے نام سے فائدہ اٹھا کر ایک نیا حلقہ قائم کر لیا گیا جو تاریخ میں فیثا غورث دبستان کے نام سے مشہور ہوا۔

عیسائیت کے عالم وجود میں آنے سے کچھ عرصے پہلے علمی دنیا میں یہ دبستان خصوصی مقام حاصل کر چکا تھا۔یہی وہ بنیاد تھی جس پر مغربی ایشیا اور اسکندریہ میں صوفیانہ تصورات ظاہر ہونا شروع ہوئے۔یہ ایک ایسی تحریک تھی جو دوسری صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر دوسری صدی تک ان تمام ملکوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی۔

چین میں تصوف کی نشو نما اور آغاز ماؤزی دور میں ہوا۔ماؤزی چین میں تصوف کا بانی ہے۔ماؤزی اور اس کے شاگردوں نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات سے مایوس ہو کر عملی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔کنفیوشس ماؤزی سے کافی چھوٹا تھا۔اور اس نے ماؤزی سے ملاقات کی تھی۔

ماؤزی گروہ نے محض دنیا ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے نظریے کی حمایت میں ایک فکری نظام بھی پیش کیا۔یہ کام ایک چینی صوفی یانگ چو(YONGCHO)نے انجام دیا۔اس کے دو بنیادی تصورات تھے۔پہلا یہ کہ ہر شخص کو صرف اپنی فکر کرنی چاہئے اور دوسرا یہ کہ اس دنیا کی ہر چیز سے نفرت کرنی چاہیے۔لیکن زندگی کی پوری قدر کرنی چاہیے۔ ایک شخص نے(YONGCHO)سے سوال کیا۔

اگر اپنے بدن سے ایک بال اکھاڑ کر ساری دنیا کو بچا سکو تو کیا تم اس کے لیے تیار ہو گے ؟

(YONGCHO)نے کہا۔ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔اس شخص نے پھر کہا۔فرض کرو ایسا ممکن ہو جائے پھر تمہارا کیا جواب ہے!(YONGCHO)خاموش رہا اور وہ شخص باہر نکل آیا اور اس نے یانگ چو کے شاگرد سے اس بات کا ذکر کیا۔شاگرد نے اپنے استاد مدافعت میں اس شخص سے کہا۔فرض کرو تمہیں کہا جائے کہ تم اپنی کھال کا کچھ حصہ جسم سے الگ کر کے دے دو۔تو تمہیں دس ہزار سونے کے سکے ملیں گے تو کیا تم تیار ہو جاؤ گے۔

اس نے جواب دیا کہ ہاں۔شاگرد نے پھر کہا۔اگر تمہیں اپنے کسی عضو کو کاٹ کر دینے سے بادشاہت مل جائے۔۔۔۔اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔وہ شخص خاموش رہا یانگ چو کے شاگرد نے کہا کہ کھال کے مقابلے میں مال بالکل غیر اہم ہے اور ایک عضو کے مقابلے میں کھال کی

کوئی حیثیت نہیں لیکن کھال کے بہت سے ٹکڑے مل کر ایک عضو کے برابر اہم ہو جاتے ہیں۔ایک بال جسم کے ہزاروں حصوں میں سے ایک ہے۔تم اسے کیسے غیر اہم قرار دے سکتے ہو۔

یانگ چو کا دوسرا اصول ہے کہ ہر چیز سے نفرت کی جائے لیکن زندگی کی پوری قدر کرنی چاہیے۔اس کی یہ تشریح کی جاتی ہے۔

زندگی ہماری ملکیت ہے ہمیں اس سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔بادشاہ بننے کی عزت سے کہیں زیادہ عزت ہمارے نفس کو حاصل ہے۔ ساری دنیا کی دولت اس کے مقابلے میں گھاس کے تنکے کے برابر بھی نہیں۔اگر ہم نفس کو ایک لمحے کے لیے بھی گم کر دیں، یا اس پر موت وارد ہو جائے ۔تو پھر اس کو دوبارہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ماؤزی کہتا ہے پہاڑ کے درخت خود اپنے دشمن ہیں۔اور بھڑکتی ہوئی آگ اپنے بجھنے یعنی فنا ہونے کی خود ذمہ دار ہے۔۔۔۔۔شاہ بلوط کا درخت جب کلہاڑے کی کلہاڑی سے بچ گیا۔تو اس نے ایک شخص سے خواب میں کہا۔میں کافی مدت سے غیر مفید ہونے کی کوشش کر رہا ہوں کئی مواقع ایسے آئے کہ میں موت سے بال بال بچا۔۔۔۔۔اب میں نے غیر مفید ہونا سیکھ لیا ہے۔جو میری ذات کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔اگر میں فائدے مند ہوتا تو کیا میں اتنی عظیم الشان جسامت کا مالک ہو سکتا تھا؟

حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کے لے ماؤزی تلقین کرتا ہے کہ خواہشات پر قابو پایا جائے۔ریاضت امر لازم ہے۔ریاضت سے انسان خارجی دنیا کی بے ثباتی سے واقف ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے مشکلات سے بے نیاز ہو جاؤ۔آنکھوں کی روشنی کو مدھم کر لو اور مٹی کو رام کر لو۔پانچ رنگ آنکھوں کو چندھیا دیتے ہیں۔موسیقی کے پانچ راگ کانوں کو بیرا کر دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے راستے اور دروازے بند کر لو تا حیات تمہاری طاقت کم نہ ہو گی۔اگر تم نے راستوں کو کھلا چھوڑ دیا اور صرف دنیا کے کاموں میں منہمک ہو گئے تو تمہیں کوئی غیبی مدد نہیں پہنچے گی۔

۱۴ سو سال پورے ہونے کے بعد آج بھی یہ سوالیہ نشان اپنی جگہ موجود ہے کہ :

اُمّت مسلمہ کو موجود بحران اور ذلّت کی زندگی سے کس طرح نکالا جائے ؟ اُمّت کی اصلاح کی کشتیاں ساحل سلامتی تک پہنچانے کے لئے ۱۴ سو سال میں جتنی تنظیمیں، جتنی تحریکیں اور جتنے گروہ بنے۔ گم کردہ راہ عوام نے ہر کسی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا سلامتی تک لے جانے والی ہر کشتی میں عوام ذوق و شوق سے سوار ہو گئے۔ لاکھوں مخلص اور ہزاروں زاہد لوگوں کے ساتھ ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں منافق بھی شامل ہوتے رہے۔ ان تنظیموں نے شب و روز کام بھی کیا، لیکن اتنے طویل عرصے میں کامیابی کسی کا بھی مقدّر نہ بنی۔ کوئی ایسی تنظیم سامنے نہیں آئی جس کا سفینہ کُلیتاً اخلاص کا پیکر ہو۔ ہر تنظیم نے اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سّنت کا پرچار کرنے کا دعٰوی کیا۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا رہا کہ ہم اللہ کی پسندیدہ منزل پر پہنچانے کا ادراک رکھتے ہیں، ہمارے پاس اسلامی نشاۃ ثانیہ کا ورثہ ہے۔ ہم اس نقشے سے واقف ہیں جس نقشے پر فتوحات رقم ہیں۔ جن راہوں پر چل کر حضرت عمر فاروقؓ کی فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ جب کہ حضرت عمر فاروقؓ کی داخلی اور خارجی زندگی کا ایک ایک عمل، پورا کرداری خاکہ تاریخ کے صفحات میں موجود ہے۔

ہم جب تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ امّت نے جس تنظیم کے ساتھ امیدیں وابستہ کیں، امید پوری نہیں ہوئی بلکہ امّت کے اوپر بے حسی، خود غرضی اور مزید مایوسی مسلّط ہو گئی۔ انتہا یہ کہ امّت میں سے خود احتسابی کا عمل ختم ہو گیا۔ ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ آتا رہا اور ناکامی کے اسباب بیان ہوتے رہے۔ کسی نے کہا، ناکامی کی وجہ خارجی ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا، ناکامی کے اسباب خارجی نہیں داخلی ہیں۔

خارجی اسباب کو وجہ سمجھنے والوں نے بتایا کہ غیر مسلم لابی نے کشتی کو کنارے نہیں لگنے دیا اور خارجی رہزنوں نے سمندر کو طوفانی بنا دیا۔ اور ان طوفانی لہروں نے کشتی کو کنارے نہیں لگنے دیا۔ اس طرزِ کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کے پھیلاؤ میں باہر کی مداخلت دیوار بنتی رہی۔ پالیسی بنانے والوں کے اوپر ہمیشہ خارجی طاقتوں کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ناکامی اسباب داخلی اثرات کو قرار دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تنظیم کا سربراہ اور کارکنان جو کچھ کہتے ہیں فی الواقع ان کا عمل اس کے خلاف ہوتا ہے۔ ہر شخص الا ماشاءاللہ اقتدار کا خواہش مند اور ہوس کا بھوکا ہے۔ دوسروں کو عبرت کی باتیں سناتا ہے لیکن خود اپنے گریبان میں نہیں جھانکتا۔

دوسروں کو نصیحت، تلقین اور تبلیغ اس لیے کرتا ہے کہ اس عمل سے اس کی اَنا کو تسکین ملتی ہے۔ خدائی نظام کو قائم کرنے کے لیے جن صعوبتوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس پر بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں۔ تنظیموں اور تحریکوں نے جو لائحہ عمل مرتب کیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جس پر عوام زیادہ عرصے تک اپنے شب و روز گزار سکیں۔ آج ایک آدمی بھوکا ہے۔ رہنے کے لیے اُسے گھر چاہیئے۔

بچّوں کی تعلیم کے لیے اُسے روپیہ چاہیئے۔ بدن ڈھانپنے کے لیے کپڑا چاہیئے۔ یہ تمام بنیادی ضرورتیں محض وعدہ فردا سے پوری نہیں ہو سکتیں۔

ہر نئی تنظیم کا سربراہ بہانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ اسلامی نظامِ عمل قائم کرنے میں میری پالیسیوں پر عمل کر لیا گیا تو میں اسلامی فلاحی مملکت کو دوبارہ زندہ کر دوں گا۔ لیکن کس طرح فلاحی مملکت قائم ہو جائے گی یہ دستور کوئی نہیں دیتا۔

ہر وہ شخص جو اسلامی ریاست کا پرچار کرتا ہے اس کی زندگی حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ اسے بہترین لباس بہترین رہائش، بہترین گاڑی، سفر میں جہازوں کی سہولت، انواع و اقسام کے کھانے اور بچّوں کی اعلیٰ تعلیم کی سہولت حاصل ہے۔ اُمّت مسلمہ کے عوام ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ عوام کی زندگی میں ان کی رمق بھی نظر نہیں آتی۔

جبہ و قبا کے ساتھ منبر نشین ہو کر وعظ و نصیحت بلاشبہ کوئی بُری بات نہیں ہے بلکہ ہر اعتبار سے احسن عمل ہے۔ لیکن جب داخلی زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے وہ سراسر اس کے برعکس ہوتا ہے جس کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

اللہ کہتا ہے:۔

جو لوگ ہماری آیتوں کا کاروبار کرتے ہیں ہم ان کا پیٹ دوزخ کے انگاروں سے بھریں گے۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۴)

محراب و منبر سے علمائے سُو پیٹ میں انگارے بھرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ ہر مسلک کا ہادی یہ کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں ناجی ہوں۔ باقی تمام لوگ بدعتی، کم یقین اور ناری ہیں۔ ناری یا ناجی ہونے کے لیے کسی کے پاس بھی سند نہیں ہے۔ کچےّ ذہن کے عوام چوپایوں کی طرح ہیں۔ جس نے جوشِ خطابت سے متاثر کر دیا اس کے پیچھے ہو لیئے۔۔۔ ہر تنظیم اپنے ہی کو اسلامی تنظیم تصوّر کرتی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ وہ حق پر ہے، باقی گم کردہ راہ ہیں۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ چودہ سال گزرنے کے بعد ہمارا قرآن وہی ہے جو نبی برحق پر نازل ہوا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب وہی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ذلّت اور گمراہی کے گہرے گڑھے میں زندہ در گور ہو رہے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وہی عمل ہے، جس پر ثابت قدم رہ کر ہمارے اسلاف نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ ایک وقت تھا کہ آج کا سائنسی دور ہمارے زیرِ اثر تھا۔ ایجادات و اختراعات کا اعلان اسلام کے دروازے سے ہوتا تھا۔ اسلام کے پیروکاروں کو عروج نصیب تھا۔ اسلام کے در سے اللہ کی مخلوق سیر اب ہو کر کھاتی پیتی تھی۔ آج ہم بدنصیب ہیں۔ بھکاری ہیں۔ خستہ اور مفلوک الحال ہیں۔

اللہ کہتا ہے، سود لینے والا اور سود دینے والا میرا دشمن ہے اور میرے ساتھ حالتِ جنگ میں ہے۔ جس بندہ کو اللہ اپنا دشمن قرار دیدے، کیا اس کی نماز ہو سکتی ہے، کیا اُس کا حج قبول ہو گا؟

اسلامی چولا پہننے والی تنظیمیں کیسے اسلامی نظام نافذ کر سکتی ہیں جب کہ ان کی زندگی بھی موجودہ دور کی بدترین دور کی مثال ہے۔ ہم نے اس المیے پر سوچ بچار کیا ہے۔ ہمارے سامنے ایک ہی بات آتی ہے:۔

ہر اسلامی تنظیم کا پہلے یہ منشو ہونا چاہیئے کہ امّت مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔دیوبندی، بریلوی، دھابی نجدی شعیہ، سنّی طبقات کو اس طرح باہم دگر شیر وشکر کر دیا جائے کہ امّت مسلمہ اللہ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہو جائے۔

اللہ کی رسّی کو متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ پکڑلو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔(سورۃ آل عمران:۱۰۳)

اُمّتِ مسلمہ ملت سے کٹ کر تفرقہ سے، طبقات میں تقسیم ہو کر ملی اور جتماعی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے انفرادی خوشحالی ذاتی معاشی ترقی، ذاتی منصب واغراض پر کبھی باعزّت زندگی نہیں گزار سکتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جس قوم نے بھی ذاتی مفاد کے گروہی تعصب کو ہوا دی، ملت میں تفرقہ ڈالا اور اس تفرقہ کی بنیاد پر خود کو جنّتی، اور دوسروں کو دوزخی قرار دیا وہ تباہ کر دی گئی۔اس کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔اس کو ذلیل وخوار کر کے زمین پر دربدر کر دیا گیا۔

اللہ کہتا ہے کہ:۔

جو قوم اپنی حالت میں بہتری پیدا نہیں کرتی، اللہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔اور اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے ایسی قوم دربدر ٹھوکریں کھا کر بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

جس نسل، جس ملک، جس قوم نے اللہ کے قانون کو توڑا، اور اجتماعی سوچ کو نظر انداز کر کے ریشم کے کیڑے کی طرح انفرادی سوچ کے غلاف میں بند ہو گئی، وہ ختم ہو گئی۔اپنی کوتاہ نظری، کوتاہ اندیشی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ایسی قوموں کی زندگی کا تار وپود بکھر گیا۔

اندلس، بخارا، سمرقند، اسپین، ہندوستان کی تاریخ اور ان پاکستان کا دولخت ہونا ہمارے سامنے ایک کُھلی ہوئی کتاب ہے۔

ہائے افسوس! خود انسانوں کے ہاتھوں زمین پر، بیابانوں میں، بحر وبر میں فساد پھیل گیا۔

۞ ظَهَرَ الفَسادُ فِي البَرِّ وَالبَحرِ بِما كَسَبَت أَيدِي النّاسِ (سورۂ روم آیت ۱۴۱تا)

چند انسانوں کی کوشش سے کمیونزم کا قلعۂ ستر سال کے بعد کچھ اس طرح زمیں دوز ہو گیا کہ جیسے اس کی بنیادیں ریت کے گھروندے پر قائم کی گئی تھیں۔ دورِ حاضر کے اقتصادی نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا بالآخر اشتراکی نظام کو اپنا لے گی۔ کیونکہ غریب لوگ نہیں چاہتے کہ دولت چند امیروں کی کنیز بن جائے۔ اور لاکھوں لوگ بے گھر بے در بھوکے پیاسے مرتے رہیں۔

سولہویں صدی عیسوی میں بڑی بڑی حکومتیں بنیں۔ اور سونا چاندی ہر حکومت کے لیے معراجِ کمال بن گیا۔ ہر حکومت سونا چاندی جمع کرنے میں لگ گئی۔ یہ حکومتی نظام تاجر برادری کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ اقتصادی مسلک جس کا مطمحِ نظر ملک میں سونے کی افراط ہے تجارتی قرار پایا۔

تجارتی مذہب کے بر خلاف دوسرا آزاد مذہب وجود میں آیا۔ آزاد مذہب کا نعرہ یہ تھا کہ فرد کو آزاد چھوڑ دو۔ ایسی صورت میں فرد اپنی مصلحت کے مطابق بہتر کام کرے گا۔ اس سے حکومت کو بھی فائدہ ہو گا۔ اس آزاد مذہب کا یہ تاثر قائم ہوا کہ دو گروہ بن گئے۔ بہت زیادہ دولت والوں کا گروہ۔۔۔۔۔۔ اور مفلس و قلاش فقیروں کا گروہ۔ صنعتی انقلاب اور مشینوں کی ایجاد نے بھی دولت مند گروہ میں اضافہ کیا۔ مزدوری گھٹ گئی۔ فقیروں کے فقر میں اور مفلس لوگوں کے افلاس میں اور اضافہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک اور گروہ وجود میں آیا۔ اس گروہ نے جب یہ دیکھا کہ امیر لوگ غریبوں کی بدولت امیر ہوتے ہیں۔ حسرت، تنگدستی، معاشی بدحالی و بدبختی امیروں کی وجہ سے دنیا پر چھا جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ امیر اور غریب کے درمیان یہی سوچ فاصلہ بن گئی۔ نتیجے میں امیر لوگ جس طرح بھی ممکن ہوا اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر دولت کے انبار لگانے میں مصروف ہو گئے۔ انھیں یہ خیال نہیں آیا کہ مزدور بھی ہماری طرح آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ مزدور کو ہماری طرح بھوک لگتی ہے۔ مزدور کو بھی ہماری طرح مکان اور دوا دارو کی ضرورت ہے۔ فاصلہ بڑھتا رہا، مزدور کے پیٹ کی آگ بھڑکتی رہی، بچّے تعلیم سے محروم ہوتے رہے۔ اور ایسا وقت آ گیا کہ مزدور نانِ شبینہ سے محروم ہو کر کم مزدوری قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔۔۔۔۔ تاکہ وہ اپنے بچّوں کو روکھی سوکھی روٹی کھلا سکے۔

مزدور جماعت کے حامیوں نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ کہ دولت جس سے امیر طبقہ کھیل رہا ہے۔ صرف انہی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس میں مزدور کی محنت برابر کی شریک ہے۔ عدل و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ دولت کی تقسیم مزدوروں اور اہل ثروت کے درمیان مشترک ہو۔ اور اس طرح ایک نئے نظام کی ترتیب عمل میں آئی۔ اس نئے نظام یا مذہب کو اشتراکیت کا نام دیا گیا۔ اشتراکیت کا بانی کارل مارکس تھا۔ اس نے کہا۔ ’’اجتماعی مفادات حاصل کرنے کے لیے ہر گروہ کو خود حالات کی درستگی کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔‘‘

اِن نظریات اور مذاہب پر غور کرنے سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ ہر نظریہ کسی نہ کسی جانب داری کی تصویر ہے۔ اِن مذاہب سے فَرد کو انصاف نہیں ملا۔ ہر مذہب والے یہ خیال کرتے رہے کہ ان کا مذہب سب سے اچھا ہے اور فرد کی خوشحالی کا ضامن ہے۔ مگر یہ سب کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں کر سکے اور انسانی برادری کو پریشانی اور محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ہر دستوری دستاویز میں سب سے اہم اور بنیادی سوال اقتدارِ اعلیٰ کا ہوتا ہے، باقی تمام امور اس کے گرد گھومتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے اپنے نظریے اور خیال کے مطابق اقتدارِ اعلیٰ کی تشریح کرتا ہے۔

(۱) کسی نے کہا کہ مقتدرِ اعلیٰ بادشاہ ہوتا ہے۔ بادشاہ میں لومڑی کی صفت ہونا چاہیئے تاکہ وہ مکر و فریب کے جال بچھا کر لوگوں کو اپنے قبضے میں رکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ کا شیر صفت ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ بھیڑوں کو خوف زدہ رکھ سکے۔

(۲) اقتدارِ اعلیٰ افراد کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے۔

(۳) اقتدارِ اعلیٰ تمام افراد کی مشترک ملکیت ہے۔

دستور بنتے رہے، بگڑتے رہے۔ ان میں تنسیخ و ترمیم ہوتی رہی۔ مگر کسی ایک بات پر اتفاق رائے نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔۔اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی رہی، پھر جمہوری نظام کا شور برپا ہوا۔ جس کی رو سے عوام کی حکومت عوام پر ہوتی ہے۔ لیکن عملاً یہ نظام بھی ان چند خاندانوں کی ملکیت بن گیا، جن کا قبضہ پیداوار کے ذرائع پر تھا۔ دیکھنے میں اس کا چہرہ روشن اور تابناک تھا۔ لیکن اندر کا حال قبر کے مردے جیسا تھا۔۔۔۔۔۔۔کہ قبر کا حال مردے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غور و فکر کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نظام بھی اللہ کی معصوم اور غریب مخلوق کے خلاف ایک تازیانہ عبرت ثابت ہوا۔ پھر یہ کہا گیا کہ ذرائع پیداوار پر قابض لوگوں سے اقتدار نکال کر مزدوروں کے سپرد کیا جائے تاکہ سرمایہ کاروں کی اجارہ داری ختم ہو جائے اور مزدور مقتدر ہو جائے۔۔۔۔۔۔اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہو گا جب کمیونسٹ پارٹی کو اقتدارِ اعلیٰ سونپ دیا جائے۔ یہ ساری کتھا پڑھ کر اس کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ مذاہب اور نظریاتِ مملکت اقتدارِ اعلیٰ کے گرد گھومتے ہیں۔ اور اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنے میں جب بھی کسی گروہ کو کامیابی حاصل ہوئی وہ خود دولت کے انبار جمع کرنے میں ھل من مزید کی عملی تفسیر بن گیا۔

ابھی حال میں خبر آئی ہے کہ "چاؤ شسکو نے ستّر کمروں پر مشتمل محل تعمیر کروایا تھا۔ اور بیگم چاؤ شسکو کے جوتوں میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔"

یہ سب نظام تناور درخت بننے سے پہلے کیوں دیمک خوردہ درختوں کی طرح پیوند زمین ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔؟ اور ہو جائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے علم اور عقلی برتری کے زعم میں کبھی نہیں سوچا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔انسان خود مخلوق ہے۔ چونکہ وہ مخلوق ہے اور مخلوق کے ناطے زندگی کے ہر ہر مرحلے پر مجبور ہے۔ اس لیے وہ اس قابل نہیں ہے کہ ریاستی امور میں خود ساختہ قوانین سے اقتدارِ اعلیٰ پر فائز ہو۔

انسان جب خود پیدائش پر قدرت نہیں رکھتا اور موت کو شکست نہیں دے سکتا، تو پھر وسائل کی تقسیم کا قانون، وسائل پیدا کرنے والے کی ماضی کے خلاف کیسے بنا سکتا ہے؟

آج جب ہم عالم اسلام کی زبوں حالی اور مسلم قوم کا شیرازہ بکھرنے کی وجہ تلاش کرتے ہیں تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ اسلام میں پہلی چپقلش دولت کے انبار جمع کرنے پر شروع ہوئی۔

حضرا ابوذر غفاریؓ وہ صحابی ہیں جن کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

''ابوذر میرے ساتھ زندہ رہا

اور میرے ہی ساتھ اٹھے گا۔''

حضرت ابوذر غفاریؓ بار بار اس آیت کی تلاوت کرتے تھے۔

''اور وہ لوگ جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے۔ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔''(سورۃ التوبۃ)

مسلم قوم کا عروج اس دن گہنا گیا تھا جس روز اسلام میں انسان ساختہ اقتدار اعلیٰ (ملوکیت) داخل ہوا تھا۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اُسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے۔اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔''(۳۔۷۹)

دنیا اُسی وقت سُکھ چین سے واقف ہوگی اور سکون کا سانس لے گی جب قرآن کے مطابق اللہ علیم و حکیم کے اقتدار اعلیٰ کو دنیا میں نافذ کیا جائے گا۔۔۔۔۔یہ نہیں ہوا تو نظریات اور نظام ہائے حکومت بنتے رہیں گے۔اور دنیا کی آنکھوں سے روشنی اوجھل ہوتی رہے گی۔

مذہب کس کام آتا ہے اور مذہبی اور غیر مذہبی انسان میں کیا فرق ہے؟

مذہب انسان کو اچھائی اور برائی کے تصورات سے آشنا کرتا ہے۔ مذہبی انسان اچھائی اور برائی کے تصورات پر اپنے افعال و اعمال کو تولتا ہے اور خیر و شر کے ذرّات کی چھان پھٹک کر کے اچھائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے۔ برائی سے اجتناب کرتا ہے اور اچھائی اختیار کرتا ہے۔

مذہبی جذبے نے لاشعوری طور پر زندگی کے جن کرداروں کا تعین کیا ہے ان میں امید کا عنصر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جلال و جمال کی آمیزش سے وہ اپنے لئے ایک محل تعمیر کرتا ہے جس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جن سے جمالیاتی تقاضے پورے ہوں۔

ہم جب انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں مذہبی انسانوں کے دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ مذہب کو سادگی اور کم سے کم دنیاوی لذّات سے مبرّا لائحہ عمل تصور کرتا ہے۔ اس گروہ کے نقطۂ نظر سے دنیا کی ہر چیز فانی ہے اس لئے دنیا کی آسائش و آرام کو وہ مذہب کی پیروی میں دیوار سمجھتا ہے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ انسان جس قدر دنیاوی آسائش و آرام کو اپنے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ اسی مناسبت سے وہ دنیا میں پھنستا اور دھنستا چلا جاتا ہے اور نتیجے میں اس کے اوپر اچھائیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور برائیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے لوگ مذہب میں سادگی کے بجائے شوکت و عظمت کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ نے زمین میں سے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کا کوئی مصرف ضرور ہونا چاہئے اور مصرف یہ ہے کہ ان چیزوں کو استعمال کیا جائے اگر چیزوں کو استعمال نہیں کیا گیا تو زمین پر سے وہ چیزیں مفقود ہو جائیں گی۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ سورج کی روشنی زمین پر اس لئے منعکس ہوتی ہے کہ اسے زمین پر بسنے والی مخلوق اور مخلوق میں افضل مخلوق انسان اس روشنی سے استفادہ کرے اگر زمین پر موجود دھوپ سے انسان قطع تعلق کر کے کسی ایسے غار میں سکونت اختیار کر لے جہاں سورج کی شعاعیں نہ پہنچ سکتی ہوں تو یہ انسان کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ زمین پر موجود غذائیں اور زمین پر موجود دوسرے وہ تمام وسائل جو کسی نہ کسی طرح انسان کے کام آتے ہیں اگر استعمال نہ کئے جائیں تو یہ دنیا بے رونق ہو جائے گی۔

ہم جب عام انسانی گروہوں سے ہٹ کر انبیاءؑ کے گروہ کی طرزِ فکر کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ مرتّب ہوتا ہے کہ مذہب ایک ضابطۂ حیات ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے مخصوص بندوں کے بنائے ہوئے فارمولوں اور زمینی رشتوں پر قائم ہے۔ جب کوئی پیغمبر اس دنیا میں آتا ہے اور خدا کی طرف سے یہ فرض اسے سونپ دیا جاتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی میں وہ شعور بیدار کرے جو انسان کو حیوانات، نباتات اور جمادات سے ممتاز کرتا ہے تو پیغمبر اپنی نوع کی عادات، اطوار، روایات و رسومات کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ ترتیب دیتا ہے اور اس ضابطے کو خدا کے حضور پیش کر کے اس کی منظوری لے لیتا ہے۔ اور جب خدا اس ضابطۂ حیات کو منظور کر لیتا ہے تو خدا کا فرستادہ یہ بندہ اس ضابطۂ حیات کو نوعِ انسانی میں مذہب کے نام سے پھیلا دیتا ہے اور یہ روشناسی کسی اُمّت یا قوم کی شناخت بن جاتی ہے۔

جو لوگ عقلی تجربات کو بنیاد بنا کر نوعِ انسانی کے جوہر خدا کے فرستادہ بندے کے بنائے ہوئے اصول وضوابط پر اختلافِ رائے کر کے اپنی ذات وصفات میں امتیاز قائم کرنا چاہتے ہیں وہ لاحاصل کوشش کے سَراب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو خدا کے فرستادہ بندوں کے پیش کردہ نظامِ حیات پر عقیدت سے عمل کرتے ہیں انہیں صراطِ مستقیم مل جاتا ہے۔

پیغمبروں کا بنایا ہوا نظامِ حیات انسان کے لئے دو راستے متعین کرتا ہے۔ ایک راستے پر شر کی کرشمہ سازیاں ہیں اور دوسرے راستے پر خیر کے ثمرات ہیں۔ خیر اور شر کے دونوں راستوں میں سے اس راستے کا انتخاب جس راستے پر دین ودنیا کی فلاح ہے شریعت ہے۔

شریعت انسان کے لئے جو لائحہ عمل پیش کرتی ہے اس کے دو رُخ ہیں...... ایک رُخ جسمانی کردار کا تعین کرتا ہے کہ انسان کو زمین پر کس طرح زندگی گزارنی چاہئے؟ اس کا اخلاق کس طرح کا ہونا چاہئے؟ حقوق العباد کیا ہیں؟ حقوق العباد پورے کرنے کے بعد اللہ کے حقوق کیا ہیں؟ اور اللہ کے حقوق کس طرح پورے کئے جاتے ہیں؟ عبادات کس طرح کرنی چاہئیں۔ بحیثیت مخلوق کے خالق سے رشتہ کس طرح قائم ہے؟

شریعت کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ جسمانی اعمال ووظائف کے ساتھ ساتھ انسان کا اللہ سے ایک روحانی رشتہ ہے۔ اگر اللہ کے ساتھ یہ رشتہ مستحکم ہے تو انسان **خسر الدنیاوالاخرہ** سے محفوظ ومامون ہے۔

جب تک کسی انسان کے اندر شریعت کے دونوں رُخ پوری طرح متحرک نہیں ہوں گے وہ مذہبی انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ شریعت زندگی گزارنے کا ایک مربوط، خدا کا منظور کردہ اور پسندیدہ ضابطہ ہے...... یہ ایسا ضابطہ ہے جو انسان کو خدا سے نہ صرف متعارف کراتا ہے بلکہ اتنا قریب کر دیتا ہے کہ انسان خدا کی ذات سے ہمکلام ہو جاتا ہے اور خدا کا یہ فرمان اُس کا مشاہدہ بن جاتا ہے......

''میں انسان کی رگِ جان سے زیادہ قریب ہوں۔ جہاں تم ایک ہو وہاں میں دوسرا ہوں۔ جہاں تم دو ہو وہاں میں تیسرا ہوں...... تم جو چھپاتے ہو وہ سب میرے سامنے ہے۔ جو تم کرتے ہو وہ سب میرے علم میں ہے۔''

اللہ ہی ظاہر ہے اللہ ہی باطن ہے

اللہ ہی ابتدا ہے اللہ ہی انتہا ہے

ہر چیز اللہ کی طرف سے آرہی ہے

اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے

یہی وہ طرزِ حیات ہے جس کو طریقت کہا جاتا ہے۔ جب کوئی بندہ شریعت کے دوسرے رُخ طریقت پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو اپنی دنیا کے علاوہ دوسری لاکھوں کروڑوں دنیائیں اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ ماورائی دنیاؤں میں گھومتا پھرتا ہے اور وہاں کے رہنے والے انسان اور جنّات اس کے ہم خیال وہم مشرب بن جاتے ہیں۔ یہ بات اُس کے اوپر آشکار ہو جاتی ہے کہ زمین کی حیثیت الگ ہے، چاند کی حیثیت الگ ہے۔ اس طرح سورج اور سیارے اپنی منفرد ''انا'' رکھتے ہیں اور سات آسمان دراصل سات شعور ہیں...... یہی وہ سات شعور ہیں جن کی تقسیم سے کوئی صاحبِ طریقت انسان کھلی

آنکھوں سے اٹھارہ ہزار (۱۸۰۰۰) عالمین کو دیکھ لیتا ہے اور جان لیتا ہے......اس دنیا کی طرح اور عالمین میں بھی انسانوں کی آبادیاں ہیں۔اور دوسرے عالمین میں بھی کھیتی باڑی ہوتی ہے۔زمین اپنی کوکھ سے وہاں کے انسانوں کے لئے وسائل کو جنم دیتی ہے......اور ان دنیاؤں میں بھی انسان کھائے پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔[1]

[1] حوالہ-مارچ۔۸۹۔ر۔ڈ۔آوازدُوست۔

اباجان! آپ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں۔ایسانہ ہو کہ چھری چلاتے وقت، شفقت پدری اطاعت کے جذبات پر اثرانداز ہو۔

باپ کا دل بیٹے کی محبت سے مزید سرشار ہو گیا اور اس لمحے ایسے بیٹے کا باپ ہونے پر فخر ومباحات کے جذبات مزید گہرے ہو گئے۔اور آخر کار ایک بوڑھے باپ نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر خود اپنے ہاتھ سے اکلوتے معصوم بیٹے کی گردن پر چھری چلادی۔اور یوں اپنے رب کے حضور اپنے یقین و اطاعت کا مکمل ثبوت پیش کر دیا۔لیکن باپ نے اس کام سے فارغ ہو کر جب آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا معصوم لختِ جگر صحیح وسلامت موجود تھا۔اس کی جگہ ایک مینڈھا ذبح ہوا پڑا ہوا تھا۔

اللہ تعالی نے ان کی یہ قربانی منظور فرمالی تھی۔

پروردگار عالم کو اپنے ان فرمانبردار بندوں کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اس نے رہتی دنیا تک اپنے نام لیوا بندوں کے لئے اس قربانی کی یاد منانے کا حکم دے دیا اور اس کے ساتھ ہی عیدالاضحی کی قربانی لازم قرار پائی۔اور وہ ملعون جو، ان کو راہ سے ہٹانے آیا تھا اس کی مزید ذلت وخواری اس طرح ہوئی کہ ہر سال حج کے موقع پر لاکھوں فرزندان توحید ان دونوں برگزیدہ نبیوں کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے شیطان کو کنکریاں مار کر اس کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔لیکن شیطان آج بھی اپنے کام میں مصروف ہے چونکہ اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی ہوئی ہے۔

شیطان کھلے اور چھپے ہوئے طریقوں سے نوع انسانی کو ورغلانے میں مصروف ہے۔لاکھوں مسلمان ہر سال حج کے موقع پر شیطان کو کروڑوں کنکریاں مار کر اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

لیکن۔۔۔۔

کیا ہم نے اپنے اندر موجود شیطان کو بھی کنکریاں مار کر مفلوج کر لیا ہے؟

میں نے آج یہ خواب دیکھا ہے۔

اس کی تعبیر کیا ہے؟

یہ خواب بجائے خود تعبیر ہے۔

پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

یہ تو خود تم پر منحصر ہے۔اصل بات تمہیں بتائی جاچکی ہے۔

میں اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اور پھر۔۔۔۔

ایک خواب کی تعبیر پانے والوں کا یہ دو رُکنی قافلہ اپنے یقین، محبت، ایثار اور اطاعت کا ثبوت دینے کے لیے اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

راستے میں محبوب کے ایک نافرمان اور محبیّن کے ایک دشمن نے دوست بن کر سمجھانے کی کوشش کی۔یہ سمجھانے کی نہیں، راہ سے ہٹانے کی کوشش تھی۔اٹل ارادوں کو متزلزل کر دینے، یقین کو شک میں تبدیل کر دینے، ایمان کو کمزور کر دینے کی کوشش تھی۔اور یہ کوشش اسی کام کا ایک حصہ تھی جس کے لئے اس نے اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے مہلت مانگی تھی اور یہ مہلت اسے عطا کر دی گئی تھی۔

لیکن ہر بار۔۔۔۔۔۔

یہ کوشش کرنے والا یقین کی دولت سے سرشار لوگوں کے سامنے منہ کی کھاتا رہا تھا۔ مگر اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ ہر شکست کے بعد بجائے اس کے کہ نصیحت حاصل کرلیتا اور اپنی نافرمانیوں کا سلسلہ مزید دراز نہ کرتا اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ایک کے بعد دوسرے شخص کی تلاش میں لگا رہا۔

یقیناً اسے بہت کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں اور نوعِ انسانی کے کمزور یقین رکھنے والے لوگ اس کے دامِ فریب میں آتے گئے۔ لیکن جو اس کا اصل نشانہ تھے ان کے مقابلے میں کامیابی کی اس کی حسرت ہی رہی اور ان سے کبھی لعنت ملامت کبھی جھڑکی اور کبھی پتھر کھانے پڑے اور اس روز بھی وہ پتھروں کی مار سہہ کر تلملاتا ہوا، اپنی ناکامی کا تماشہ دیکھتا رہا۔

باپ نے اپنے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا اور پھر ایک تیز دھار چھری باپ اور بیٹے کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اچانک بیٹے نے باپ کو آنکھوں پر پٹی باندھنے کا مشورہ دے کر اپنی اطاعت کا ایک اور لازوال ثبوت پیش کر دیا۔

قرآن پاک جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسانی کو عطا کردہ ضابطہ حیات ہے۔ جس میں ایک فرد کے لئے، ایک ملت کے لئے حتیٰ کہ پوری نوع انسانی کے لئے زندگی کی ابتدا سے لے کر انتہا تک ہر ہر مرحلہ کے لئے رہنمائی اور ہدایت موجود ہے۔ یہ ایک عظیم کتاب ہے جو نہ صرف مذہبی، سماجی، معاشی، اخلاقی، قانونی، سیاسی، حربی شعبوں میں رہبری کرتی ہے بلکہ سائنسی اور روحانی شعبوں میں بھی ہر قدم پر رہنمائی کرتی ہے۔ یہ عظیم خالق کا عطا کردہ وہ کلام ہے جو ایک انسان کو کائنات کی ساخت پر تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ لبّیک کہنے والوں پر نئے نئے اسرار و رموز آشکار کرتا ہے۔ یہ کتاب کائناتی فارمولوں کی دستاویز ہے اور اس دستاویز کا نزول رمضان المبارک کے مقدس اور محترم مہینے میں شروع ہوا۔

انسان کامل، محبوب خدا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی غارِ حرا میں طویل ریاضتوں اور مراقبوں کے بعد رمضان المبارک کی ایک انتہائی متبرک شب میں نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ کے نمائندہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم کی تلقین اور تخلیق کا ایک فارمولا ایک ساتھ لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شب قدر میں جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو پہلے روز حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سورہ علق کی ابتدائی چار آیتیں حضور اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائیں۔

**اقراء باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علقo اقراء وربک الاکرم o الذی علم بالقلم o** پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے۔ اور آپ کا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا۔ (سورۃ العلق: ۱-۴)

رمضان المبارک کی پھر آمد آمد ہے۔ اس مہینے میں جہاں امت مسلمہ صوم و صلوٰۃ و نوافل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کر کے اجر و ثواب کی مستحق بننے کی کوشش کرتی ہے۔ وہاں پوری امت کو اپنے مالک، اپنے خالق کے عطا کردہ قرآن پر بھی زیادہ سے زیادہ تفکر اور عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ قرآن پاک پر پورا پورا ایمان لائے۔ اور اس پر پورا پورا عمل کر کے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس عمل میں عبادات، صدقہ و خیرات اور قربانی کے ساتھ ساتھ ایک اچھا مسلمان بننے کے لئے قرآن کی اس دعوت کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے جن کا تعلق خود انسان کی تخلیق کے مقصد سے ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین اوصاف ہیں۔ لیکن خود قرآن سے تفکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اور صرف اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا نہیں کیا ہے۔ انسان کے مقصد تخلیق میں دیگر کئی رموز بھی پنہاں ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی ابتدائی چار آیات پر بھی تفکر کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرماتے ہیں۔

پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے۔ اور آپ کا رب یہ سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے لکھنا سکھایا۔ (سورۃ العلق: ۱-۴)

رمضان المبارک کی برکتوں اور نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے خواہشمند مسلمان خواتین و حضرات! کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اس رمضان سے ہم اللہ تعالٰی کے کلام کو محض ثواب کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ پڑھنے کے بجائے یا محض کاروبار میں برکت کے لئے وظیفے کے طور پر پڑھنے کے بجائے یا محض گھریلو پریشانیوں اور بیماریوں سے نجات کے لئے ورد کرنے کے بجائے اپنے خالق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کو سمجھنے، اس پر تفکر کرنے اور اس پر حقیقی معنوں میں عمل کرنے کے لئے پڑھیں گے۔

اسلام ایک نظام اور ایک ضابطہ حیات ہے۔اس کی روحانی اور نورانی تعلیمات انسان کے سفرِ حیات میں قدم قدم پر موڑ موڑ پر ہر لحہ ہر آن اس کی راہنمائی کرتی ہیں۔ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان زبان سے اقرار کرے۔اور دل سے تصدیق کرے اور عمل سے اس اقرار و تصدیق کی تکمیل کرنے کے بعد اس پر قائم بھی رہے یہی اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں۔

میں اپنی زبان سے اس عہد کا اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہوئے گواہی دیتا ہوں کے اے اللہ ! تو ایک ہے اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔تو بے نیاز ہے،توسب سے بڑا ہے، تیرا کوئی ہمسر نہیں،تو بے مثال ہے،تو تمام برائیوں سے پاک ہے۔سب اچھائیاں تیرے ہی لئے ہیں۔ تمام تعریف و توصیف کا تو ہی سزاوار ہے۔تو کھلی چھپی ہر بات کا علم رکھتا ہے۔تو دلوں کے بھید کو جانتا ہے عیبوں کو چھپاتا ہے اور غلطیوں سے در گزر کرتا ہے۔اے اللہ ! میں ایمان لایا تجھ پر جیسا کہ تو اپنے ناموں اور صفات کے ساتھ ہے۔اے اللہ ! میں ایمان لایا تیرے احکامات اور تعلیمات کی حامل تمام آسمانی صحائف اور کتابوں پر میں ایمان لایا زبور، توریت،انجیل اور آخری کتاب قرآن پر،اور اس بات پر کہ اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نازل نہیں ہوگی ،اور اس بات پر کہ یہ ایک مکمل نظام حیات اور ضابطہ زندگی ہے۔اور اس میں زندگی کی تمام باتوں،معاملات اور شعبوں سے متعلق صریح ہدایت و رہنمائی موجود ہے۔اے اللہ ! میں ایمان لایا تیری جانب سے مبعوث و منتخب کئے ہوئے انبیاء اور رسولوں پر،اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر،اور اس بات پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی اور رسول نہیں ہوگا۔اے اللہ ! میں ایمان لایا اس بات پر کہ انسان اور دوسری تمام مخلوقات کی طرح یہ دنیا بھی ہمیشہ زندہ باقی اور قائم رہنے والی نہیں ہے،عارضی ہے،اور بالآخر یوم آخرت قائم ہوکر رہے گی۔اے اللہ ! میں ایمان لایا اس بات پر کہ تو کائنات کا حقیقی خالق،مالک اور تمام مخلوقات کا بڑا اور سرپرست اعلی ہے۔زمین اور آسمانوں کی حکومت اور اقتدار سب تیرا ہے۔تیری جلال و بزرگی والی ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی ذات سب بھلائیوں کا منبع اور سرچشمہ ہے،میں زبان سے اس بات کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے عمل سے اس کو پورا کرنے کا عہد کرتا ہوں کہ تیرے سوا کسی کی عبادت اور بندگی نہیں کروں گا۔ صرف اور صرف تیرے سامنے سر کو جھکاؤں گا۔اور کسی بھی حال میں دنیا اور رزائل نفس کے سامنے سرنگوں نہیں ہوں گا۔عزت،دولت،شہرت اور حکومت واقتدار کی ہوس اور لالچ کے بتوں کو توڑ کر صرف خدائے واحد کی یاد اور ذکر سے اپنے دل کو روشن اور منور کروں گا اور صرف تیری بندگی کروں گا۔اے اللہ ! میں تیری بارگاہ میں معافی کی درخواست کرتا ہوں اور بخشش کا طلب گار ہوں ان غلطیوں کی جو میں نے جان بوجھ کر کیں،ان غلطیوں کی جو میں نے انجانے میں اور بھول چوک میں کیں،ان غلطیوں کی جو میں نے چھپ کر کیں،اور غلطیوں کی جو میں نے کھل کر اور دکھا کر کیں۔اے اللہ ! میں ان غلطیوں سے باز رہنے کا عہد کرتا ہوں جو میرے علم میں ہیں یا جن کا علم مجھے نہیں ہے۔اور میں عہد کرتا ہوں کہ تیرے احکامات اور تعلیمات کا علم نہ صرف حاصل کروں گا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر اس کا حق بھی ادا کروں گا۔

اے اللہ ! میں خود کو تیرے حوالے کرتا ہوں اور تیری پناہ میں دیتا ہوں اس بات سے کہ میں کسی شے کو تیرا شریک بناؤں اور اس شرک سے باز رہنے کا عہد کرتا ہوں اور بیزار ہوتا ہوں تیرے احکامات اور تعلیمات کے انکار سے، جھوٹ دھوکہ اور فریب سے بداخلاقی اور بدسلوکی سے، کسی کی غیر موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنے سے،ایک کی دوسرے سے شکایت اور ادھر کی باتیں ادھر کرنے سے، کسی غلط بات کو کسی کی طرف منسوب کرنے سے جو اس نے نہ کی ہو، تیرے احکامات اور تعلیمات میں تبدیلی اور اضافہ کرنے سے، تمام غلط باتوں،بے حیائیوں، بری باتوں اور کاموں سے،

اے اللہ ! میں ایمان لایا اس بات پر کہ اچھائی اور برائی سب تیری طرف سے ہے۔ اور اس بات پر کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے۔ بے شک برائیوں سے بچنے کی طاقت اور نیک کام کرنے کی صلاحیت نہیں۔ مگر تیری عظمت و جلال والی برگزیدہ ذات سے پرامید اور پریقین ہوں۔

اے اللہ ! میں اقرار کرتا ہوں کہ ساری کائنات تیرا کنبہ ہے جبکہ تو خاندان سے ماوریٰ ہے۔ نوع انسانی کا ہر فرد میری طرح تیری مخلوق ہے۔ مخلوق کی حیثیت سے میں تخلیق کا احترام کروں گا۔ جو اپنے لئے چاہوں گا وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کروں گا۔ زمین میں شر اور فساد برپا نہیں کروں گا۔ اپنے خون کی طرح، اپنے ہر بھائی کے خون کے ایک ایک قطرہ کی حفاظت کروں گا۔

اے اللہ ! میں اقرار کرتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری نہیں کروں گا۔ بڑوں کا احترام کروں گا اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آؤں گا۔

اے اللہ ! میں جانتا ہوں کہ تیری ذات انفرادی طرز عمل کے بجائے اجتماعی سوچ کو پسند کرتی ہے۔ تو نے اپنے برگزیدہ بندوں رسولوں نبیوں اور اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے نوع انسانی کو یہ پیغام پہنچایا ہے کہ تیری ذات پاک پوری کائنات کی سرپرست اعلی ہے۔ تو چاہتا ہے کہ پوری نوع انسانی ایک کنبہ برادری تیری بنائی ہوئی زمین پر سکھ چین کے ساتھ رہے۔

اے اللہ ! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو نے اپنی مخلوق کے لیے ہر چیز عام کر دی ہے۔ انواع و اقسام کی نعمتوں سے مزین دستر خوان "زمین" کو بونے کے لیے ہمیں مفت عطا کی ہے۔ پانی کی کوئی قیمت تو ہم سے وصول نہیں کرتا۔ دھوپ مفت ہے چاندنی کا کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ ہمارے پھیپھڑے مفت کی آکسیجن بھرتے ہیں اور ایندھن کے طور پر جلاتے ہیں اور اس انرجی سے ہم زندہ اور متحرک رہتے ہیں۔ تو چاہتا تو یہ کر سکتا تھا کہ جب تک کوئی آدم ذات ایک ہزار مرتبہ ہمیں سجدہ نہیں کرے گا اسے آکسیجن فراہم نہیں کی جائے گی۔ جب تک کوئی بندہ دو نفلیں نہیں پڑھے گا اسے پانی میسر نہیں آئے گا ،جب تک کوئی بندہ ہم سے مانگے گا نہیں، اسے ہوا سے استفادہ کا حق نہیں ہو گا۔

اے اللہ ! تیری رحمت کائنات پر محیط ہے۔ اے پروردگار ! تیری شان اعلیٰ و ارفع ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ تیری مخلوق میں محبت و ایثار اور بھائی چارہ کا جذبہ عام کروں گا۔ اس دنیا کو سکون کا گہوارہ اور جنت آغوش بناؤں گا۔

اے اللہ ! جس طرح تو ہمیں عید کی خوشیاں عطا کرتا ہے، میں اور میرے برادر و ہمشیرگان، فرزند اور دختران، بچے بوڑھے ہم سب مل کر تیری عظمت و بزرگی کے گیت گائیں گے۔ مصلحتوں کے بت پاش پاش کر کے تیرے حضور سرنگوں ہوں گے۔ تیری یکتائی کے ترانے دلوں کی حرارت کے ساتھ ہماری زبان پر ہوں گے۔

اے اللہ ! میں زبان سے اور دل سے اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ تو ہی ہمارا کفیل ہے۔ تو ہی ہمارا محافظ ہے۔ اور تو ہی ہمارا دوست ہے۔

دوستو ! آؤ کہ اللہ کی حمد پڑھیں۔ یارو اقرار کرو کہ زمین کی گود کو اجاڑیں گے نہیں۔ ساتھیو ! جھک جاؤ اللہ کے سامنے جھکنے میں عظمت ہے۔ ہمدم بوریہ نشینو ! سنو کے ازل سے آواز آ رہی ہے کہ

اللہ تمہارا رفیق ہے۔ تمہاری رگ جان سے قریب ہے۔ جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے۔ جہاں تم دو ہو وہاں تیسرا اللہ ہے۔ جب تم ایک قدم اٹھاتے ہو تو اللہ دو قدم تمہاری طرف آتا ہے۔ تمہاری نیکی کو عام کرتا ہے اور تمہاری برائیوں سے چشم پوشی کر کے انہیں چھپاتا ہے۔

آؤ۔ کہ آج اس بات کا اقرار کریں کہ عید کے مبارک دن انسان بن کر آدم زاد برادری کو سکون تقسیم کریں گے۔ خود خوش رہیں گے اور اپنے بھائی بہنوں پر مسرت و شادمانیوں کے پھول نچھاور کریں گے۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔
عید مبارک!

میری دعاہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی کے ساتھ، بہترین معاش اور روزگار کے ساتھ، سعادت منداولاد کے ساتھ، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔آپ سب لوگ اور بچے جس طرح مجھ سے محبت اور عقیدت کا اظہار فرماتے ہیں اس کے پیچھے اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور اللہ کے رسول ﷺ کے وارث اولیاء اللہ کی محبت ہے۔ یہ بات ہر انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ گوشت پوست کے جسم کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دکھاوے اور آرزو کے علاوہ اس کا کوئی نام رکھیں بھی تو فہم و بصیرت کے خلاف ہے۔ پوری زندگی فنا کے اوپر بقا ہے اور بقا کے اوپر بہر حال فنا ہے۔ کسی فنائیت کو حقیقت کا نام دینا ہر گز قرینِ عقل و قیاس نہیں ہے۔ جو بھی انسان یہاں پیدا ہوتا ہے۔ جسم و جان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ جسم و جان کے ساتھ جب تک زندہ رہتا ہے کچھ نہ کچھ کروایا جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہے تو لا محالہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سے کچھ نہ کچھ کرایا جاتا ہے۔ کوئی چور اُچکّا بن جاتا ہے۔ کوئی متّقی پرہیز گار ہو جاتا ہے۔ دونوں حالات میں جسم ہی بوجھ اُٹھاتا ہے۔ کوئی ولی اللہ ہو جاتا ہے۔ جن خصوصی بندوں کو اللہ نے منتخب کر لیا تو وہ پیغمبری کے اعزاز سے نواز دیئے گئے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہر چیز کو کوئی ہستی متحرک رکھتی ہے۔ وہ ہستی جب تک متحرک رکھتی ہے جسم حرکت کرتا رہتا ہے یا اُس کے لئے جو کردار متعین ہو گیا ہے وہ کردار پورا کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔

کسی انسان کا ادب یا کسی انسان سے محبت اُس کے کردار کی وجہ سے ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ بُرے کردار کے آدمی سے کوئی محبت نہیں کرتا حالانکہ وہ بھی بقا اور فنا۔۔۔۔ فنا اور بقا میں فنا ہو رہا ہے۔

قانون یہ بنا۔۔۔۔۔ کہ مادی جسم سے محبت یا نفرت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل۔۔۔۔۔ مادی جسم کا کردار ہے۔۔۔۔۔۔ یہ کردار ہی محبت اور نفرت کا SYMBOL ہے۔

اس دنیا میں دو کردار متعین ہیں۔ ایک شیطانی کردار۔۔۔۔۔۔ دوسرا رحمانی کردار۔ شیطانی نفرت ہے، حسد ہے، بغض ہے، غیبت ہے، فساد ہے، تخریب ہے، ایذا رسانی ہے، دولت پرستی ہے اور اللہ سے دوستی کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس رحمانی کردار محبت ہے، عقیدت ہے، پیار ہے، خلوص وایثار ہے، کچھ کرنے کا جذبہ ہے، خدمتِ خلق ہے، ملک و قوم کی فلاح چاہنا ہے، اللہ سے دوستی کرنا ہے۔

شیطانی کردار کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے اور رحمانی کردار چونکہ خود اللہ کا کردار ہے اس لئے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ یہ جتنے بھی روحانی لوگ ہیں یا اللہ کے دوست ہیں، رحمانی کردار کے حامل ہیں۔ وہ خود رحمانی کردار میں زندہ رہتے ہیں اور اپنی نسل کو رحمانی کردار سے قریب کرنے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ بلا تخصیص لوگوں کو توحید کے راستے پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کی تربیت کرتے ہیں۔

سلسلہ عظیمیہ پیغمبرانہ طرزِ فکر کا حامل سلسلہ ہے۔ سلسلہ عظیمیہ اور دوسرے تمام سلاسل نقشبندی، سہروردی، قادری، چشتی، شاذلی سب رحمانی کردار کے حامل افراد کے گروہ ہیں اس گروہ کا کام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں تک رحمانی کردار کی قدریں منتقل کرنا ہے۔ ان کے فرائض میں

یہ شامل ہے کہ وہ خود باکردار ہوں تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر، ان کے کردار کو سمجھ کر ان کی پیروی کریں۔ سلسلہ عظیمیہ اور دوسرے تمام سلاسل کے عام اور ذمہ دار افراد کو چاہئے کہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت و کردار خود اپنے اوپر نافذ کریں اور اپنے روحانی تشخّص کو برقرار رکھیں۔

بچہ، بیٹا، بیٹی، بزرگ، کم تعلیم یافتہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور چھوٹے اور بڑے کے اوپر فرض ہے کہ پیغمبرانہ طرزِ فکر کو اپنے بھائیوں میں، پڑوس میں، محلے میں، شہروں میں، ملکوں میں، قوموں میں اور پوری نوعِ انسانی میں پھیلانے کی بھرپُور جدوجہد کریں۔۔۔۔۔ جو لوگ اللہ کے مشن کو پھیلانے میں جدوجہد کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جو لوگ اللہ کے مشن کو پھیلانے میں ایثار کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جو لوگ پیغمبرانہ کردار کو اپنا کر اس کردار کو گھر گھر پہنچاتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں انہیں ہدایت کے راستے پر لے آؤں گا۔ اب ہمارا کام ہے کہ تعمیری قدروں کو اپنے اوپر محیط کر کے ساری دنیا میں پھیلا دیں۔

لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ہم خود باکردار ہوں۔ ہم جھوٹ بولتے ہوں، منافقت کرتے ہوں اور دوسروں سے یہ کہیں کہ تم منافقت نہ کرو اور جھوٹ نہ بولو تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات کے حصول کے لئے ۲۲ قواعد وضوابط بیان کئے گئے ہیں اُن کو اگر پڑھ کر اُن پر غور کر کے، اُن کو یاد کر کے، اُس کی ایک ایک شق پر عمل کر کے ہم اگر اپنا کردار صحیح کر لیں تو ہم کسی سے بھی کوئی بات کہیں گے تو اُس کا اثر ہوگا اور اگر ہم نہیں بھی کہیں گے تو لوگ ہمارے کردار کو دیکھ کر ہماری تعلیمات کو قبول کریں گے۔ ہمارے قریب آئیں گے۔ ہمیں پسند کریں گے اور اس طرح یقیناً سرورِ کائنات رسول اللہ ﷺ کے روحانی مشن کا غلبہ عام ہو جائے گا۔

ہر جان روح کے بغیر بے جان ہے۔ کوئی حرکت، کوئی عمل روح کے بغیر ممکن نہیں۔

کوآرڈینیٹر: سلمان انصاری

کمپوزنگ: مصباح سلمان

فہیم قریشی

ثناء ناز

پروف ریڈنگ: نوید احمد

حماد عظیمی